ماہنامہ

تجلّی

دیوبند

62 N.P.

ایڈیٹر۔ عامر عثمانی (فاضلِ دیوبند)

فکر اور خوف کا
دل پر گہرا
اثر ہوتا
ہے
جس سے خون کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں
صافی
نظامِ عصبی کے فعل
کو دُرست کرتی ہے،
خون کو صاف کرتی
ہے اور شفاف خون
پیدا کر کے چہرے پر
تازگی لاتی ہے۔
SAFI
ہمدرد
دہلی — کانپور — پٹنہ

معتبر و مستند کتابیں

مسلم شریف (اردو مع عربی) لیجئے حدیث کی مشہور و مستند کتاب مسلم شریف کا بھی اردو ترجمہ لیجئے بلکہ اسکی جو شرح "شرح نووی" کے نام سے مشہور ہے اور تمام مدارس میں چل رہی ہے اس کا بھی ترجمہ ساتھ ہی شامل ہے۔ قیمت بغیر ترقیہ۔ ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی۔ مکمل چھ جلدوں میں۔ اٹھاون روپے۔

ابن ماجہ اردو کامل حدیث کی جو چھ کتابیں صحاح ستہ کے نام سے مشہور ہیں ان میں کی ایک ابن ماجہ بھی ہے۔ اس کا عام فہم اردو ترجمہ صرف بارہ روپے میں طلب فرمائیں۔

حیات امام احمد ابن حنبلؒ مؤلفہ:۔ استاذ ابو زہرہ جو آج کی دنیائے عرب میں علم و تحقیق کا دریا اور بصیرت و فراست کا بادشاہ ہیں ائمہ کے تذکرے لکھنے کا حق یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کر دیا ہے

قیمت ۱۰ روپے

غنیۃ الطالبین شاہ عبد القادر جیلانیؒ کے شہرۂ آفاق مضامین مانیۂ عربی ہی و اسکا سلیس ترجمہ ساتھ ساتھ۔ لاجواب تحفہ۔ دو ضخیم جلدوں میں

قیمت مکمل ۲۴ روپے

تفسیر سورۂ نور از۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ سیرت و اخلاص کو سنوارنے والی آسمانی ہدایات پر مشتمل سورۂ نور کی بہترین تفسیر، بلیغ، نفیس اور محققانہ۔ قیمت مجلد چار روپے۔

باندیوں کا مسئلہ (الدر الثمین) جہاد میں ہاتھ آئی ہوئی عورتوں کو باندی بنا کر رکھنے کی دینی و علمی حیثیت۔ کتاب کے مصنف کا ایک خط اور مولانا ابو الکلام آزاد کا جواب بھی شامل ہے۔ ڈیڑھ روپیہ

کیا ہم مسلمان ہیں؟ شمس نوید کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شہ پاروں کا مجموعہ سوز و گداز، للہیت، اخلاص، درد اور تڑپ کا مخزن۔ مجلد سوا دو روپے

ردِّ بدعت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرمودات کی روشنی میں بعض ایسی بدعات کا رد جو عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی مقبول و مروّج ہوئی ہیں۔

قیمت سوا روپیہ

تحقیق مزید "خلافت معاویہؓ و یزید" کے مصنف جناب محمود احمد عباسی کا نقش ثانی جو بہت سا تاریخی مواد آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہے۔ صحابہؓ کے سلسلے میں کسی اطمینان بخش نتیجے تک پہنچنے کے لئے یہ کتاب بنیادیں مہیا کرتی ہے۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

بدعت کیا ہے؟ بدعتوں کے رد اور سنتوں کے اثبات میں ایک مشہور و مقبول کتاب، عرس، قوالی، تیجہ، چہلم الا بلا سب کے لئے چیلنج۔ مجلد تین روپے۔

فاران کا توحید نمبر سیکڑوں صفحات کا یہ نمبر ماضی قریب میں بڑی شہرت پا چکا ہے اب پھر شائع کیا گیا ہے بدعت و زندقہ کے رد اور سنت کے اثبات میں بے نظیر چیز ہے۔ چوٹی کے علماء کے مضامین سے مزین۔ ساڑھے چار روپے۔ مجلد ساڑھے پانچ روپے۔ شائقین جلد طلب کریں ورنہ پھر پہلے کی طرح ختم ہو جائیگا اور فرمائشیں بیکار کرنی پڑیں گی۔

فارابی معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابی کے علم و فضل ان کی سوانح، کمالات، تجدید فلسفہ و منطق کے مفصل و مکمل حالات۔ پونے دو روپے

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

رحمۃ اللعالمین

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بہت کتابیں ہیں لیکن قاضی سلیمان منصورپوری ؒ کی شہرۂ آفاق کتاب رحمۃ اللعالمین آج بھی اپنی مثال آپ ہی ہے اس کا طرزِ بیان، اس کی ثقاہت اسکی جامعیت ہر چیز معیاری اور وجد انگیز ہے دل میں اُتر جانیوالا اسلوب پڑھئیے اور بار بار پڑھیئے تین حصوں میں مکمل۔ بیس روپے۔

(مجلد پچیس روپے)

نسائی شریف (اُردو مع عربی)

حدیث کی چھ معیاری کتابوں میں جنھیں اصطلاحاً صحاح ستہ کہا جاتا ہے نسائی بھی شامل ہے اس کا اُردو ترجمہ مع عربی متن ملاحظہ فرمائیے۔ تین جلدوں میں مکمل۔

ہدیہ مجلد تیس روپے

زبدۃ المناسک مکمل و مدلل

از:۔ عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ

مع اضافات مفیدہ و کثیرہ جس میں جملہ مسائل حج کو آیعدرتا نہایت تفصیل سے مع حوالجات کتب ترتیب دیا گیا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں اس سے زیادہ مستند کتاب مسائل حج پر موجود نہیں ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

بلاغ المبین (اُردو)

حضرت شاہ ولی اللہ ؒ الدہلوی ایک ایمان افروز کتاب جو شرک و بدعت کے رد میں شمشیر بے نیام سمجھی جاتی ہے۔ چار روپے۔

موضوعات کبیر (اُردو مع عربی)

مشہور حنفی عالم ملّا علی قاری ؒ نے اپنی اس کتاب میں بڑی تحقیق سے بتایا ہے کہ کونسی روایتیں حقیقت میں حدیث نہیں ہیں بلکہ غلط طور پر مشہور ہو گئی ہیں۔ اس گرانقدر کتاب کے مطالعہ سے آپکو معلوم ہوگا کہ کتنی ہی وہ روایتیں بھی جو حدیث کے نام سے مشہور ہو کر قبولِ عام حاصل کر گئی ہیں حقیقۃً بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ مجلد آٹھ روپے

مکاتیب زنداں

جیل سے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی اور میاں طفیل احمد کے خطوط۔ دو روپے

حیات امام ابن القیم ؒ

مصنفہ:۔ عبد العظیم عبد السلام شرف الدین استاد جامعۃ القاہرہ

مترجمہ:۔ حافظ سید رشید احمد ارشد ایم اے، آٹھویں صدی کے مشہور عالم امام ابن تیمیہ ؒ کے شاگرد رشید اور رفیق حافظ ابن القیم الجوزیہ کی سوانح عمری اور فقہ، عقائد اور تصوف پر ان کے بیش بہا افکار کا مجموعہ۔ وہ گرانقدر کتاب جس کی تصنیف پر جامعۃ القاہرہ مصر نے مصنف کو اسلامیات کی اعلیٰ ترین سند عطا کی۔ بارہ روپے۔

سنت خیر الانام

فتنۂ انکار حدیث کے رد میں ایک نفیس کتاب۔ اس کے مطالعہ سے عام قارئین کو حدیث کی اقسام اور مراتب و درجات وغیرہ کے بارے میں بڑی مفید معلومات حاصل ہوں گی۔ مجلد چار روپے

عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن

مصنفہ:۔ کیمبل جانسن۔ مترجمہ:۔ یونس احمر ایم اے

تقسیم ہند کی مستند داستان۔ ماضی قریب کی تاریخ کا اہم ترین باب۔ ایسے حقائق کی دستاویز جن پر سیاست گری کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دلچسپ اور عبرت انگیز۔ مجلد بارہ روپے۔

تقریریں کیجئے

جس میں تقریر کرنے کے طریقے اور ڈھنگ بتلانے کے ساتھ مصنف نے ہر موضوع پر عمدہ تقریریں بھی پیش کی ہیں۔ بدعات و خرافات کیلئے تو مصنف کے قلم نے نشتر کا کام کیا ہے۔

غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ (مجلد دو روپے)

فضائل علم و ادب

از:۔ حافظ ابن القیم ؒ۔ علم حقیقی اور علماء حق کے مراتب کا تذکرہ قرآن و حدیث اور آثار کی روشنی میں۔ اُردو ترجمہ عمدہ۔ پونے دو روپے۔

حضرت عائشہ صدیقہ ؓ

ام المؤمنین حضرت عائشہ کے احوال و تذکار معتبر کتابوں سے۔ ۸۸ پیسے۔

حیات امام طحاوی ؒ

مشہور محدث امام طحاوی ؒ کے حالات جو دلچسپ بھی ہیں اور وسیع بھی۔

قیمت ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ تجلی دیوبند

شمارہ نمبر ۷

جلد نمبر ۱۶

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے
سالانہ قیمت سات روپے ۔ فی پرچہ باسٹھ پیسے
غیر ممالک سے سالانہ قیمت ۸ اشلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے بالکل سادہ رکھیے

فہرست مضامین مطابق ماہ اگست ۱۹۶۴ء

آغاز سخن	عامر عثمانی	۶
جہنم کی ابدیت	عبید اللہ کوٹی	۱۰
تجلی کی ڈاک	عامر عثمانی	۱۱
کیا ہم مسلمان ہیں؟	شمس نوید عثمانی	۲۲
مؤتمر قاہرہ	ادارہ	۲۷
مشینی ذبیحہ	مختلف حضرات	۳۹
ایک خط	انوار احمد	۴۵
وقت کی آواز	مولانا احمد علی قاسمی	۴۸
مسجد سے میخانے تک	مُلّا ابن العرب مکی	۵۱
کھرے کھوٹے	شمس نوید عثمانی	۵۹

اشد ضروری

اگر اس اوپر والے دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچے پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا ۔۔ (وی پی سات روپے ستر پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات

ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائیگا۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
دفتر تجلی ۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

پاکستان کا پتہ :۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸ بیبنا بازار پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی (پاکستان)

مدیر
عامر عثمانی
فاضل دیوبند

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا

مندرجہ بالا پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے ۔ منیجر

آغازِ سخن

عین اس وقت جب اداریہ لکھ کر اس شمارے کی تکمیل کر دینی تھی خاکسار کو مرض نے آگھیرا۔ دو چار صفحے لکھ دینا اتفاقاً ایسی حالت میں بھی ناممکن نہیں تھا لیکن طبیعت اس پر مائل ہوئی کہ ذہنی اضمحلال میں زبردستی کچھ لکھنے کی بجائے اس بار "معاصر برہان" کا حقیقت افروز اداریہ نقل کر دیں جسے اس کے فاضل مدیر جناب سعید احمد اکبر آبادی نے جولائی کے "نظرات" میں حوالۂ قلم کیا ہے۔

جو باتیں انھوں نے کہی ہیں وہ اگرچہ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے انداز میں وقتاً فوقتاً کہتے رہے ہیں لیکن ان کے قلم سے ان کی اہمیت یوں بڑھ گئی کہ ابھی پچھلے دنوں وہ خیر سگالی کے سرکاری سفر پر تشریف لے گئے تھے لہٰذا توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ سیاسی و ملی مسائل میں ان کا اندازِ نظر ان بے ضمیر، خود فروش اور بے حیا مسلمانوں سے مختلف ہوگا جو اپنے دنیاوی منافع اور تن پروری کی خاطر حکومتِ وقت کا طنبورہ بنے ہوئے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ موصوف نے اپنے اس اداریہ سے اُس حسنِ ظن کا موقع پھر پیدا کر دیا ہے جو ہم جیسے نیازمندوں کو ان کی ذات ستودہ صفات سے مدت تک رہا ہے۔ ان کے متذکرہ سفر نے اس حسنِ ظن کی جان نکال لی تھی لیکن اب ہم خیال کرتے ہیں کہ اس سفر میں انھوں نے کسی نہ کسی حکمت سے ایمان و دیانت کا بھی کچھ نہ کچھ لحاظ ضرور رکھا ہوگا اور ایسے سفید جھوٹ نہ بولے ہوں گے جیسے قوم و وطن کے بے کردار بیوپاری عموماً بولتے ہیں۔ ویسے اس طرح کے سفروں میں جانا ہی بجائے خود ایک ایسا سیاہ داغ ہے جسے تلافیٔ مافات کی کوئی بھی حسین سے حسین کوشش شاید ہی پوری طرح دھو سکے مسلمان قوم کے دل و روح کا تاریخی رشتہ دراصل ایسے اتقیاء و صلحاء کے ساتھ جڑا ہوا ہے جنھوں نے حکومتِ وقت کے پیش کردہ عہدۂ قضاء پر جیل اور ضربِ شدید کو صرف اس خدشے کی بناء پر ترجیح دی کہ عہدہ قبول کرنے کے بعد انھیں حکومت کے دباؤ سے ظالمانہ فیصلوں پر مہرِ تصدیق ثبت کرنی ہوگی اور ان کا کردار داغدار ہو جائے گا۔ ایسی قوم ــــ اپنے انحطاط کے بدترین دور میں بھی ایسے لوگوں کو پسندیدہ نظروں سے کیسے دیکھ سکتی ہے جو نام نہاد خیر سگالی وفدوں میں شریک ہوں اور سیاست کے نام پر پیٹ بھر کر جھوٹ بولیں۔ ہم اپنے محترم مولانا سعید احمد صاحب سے نہایت الحاح و انکسار کے ساتھ استدعا کریں گے کہ وہ آئندہ کبھی اس جراءتِ رندانہ کا اعادہ نہ فرمائیں اور خواہ کیسی ہی مجبوریاں ہوں لیکن عذر و معذرت سے کام نکال لے جائیں۔

ان کے اداریہ کی ابتدائی چند سطریں ہم نظرانداز کر رہے ہیں۔ اس میں انھوں نے مسٹر کامراج کی تحسین فرماتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے چند روز میں ہی کانگریس کے جسم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔

ہو سکتا ہے کسی گہرے فلسفے کی سطح پر یہ خیال درست ہی ہو لیکن بادی النظر میں تو اس کی حیثیت "خیال برائے خیال" سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوتی۔ روح اور ہوا میں فرق ہے۔ ہوا تو بے شک ایک راہ چلتا بھی پمپ کے ذریعے کسی مجوب

میں بھر سکتا ہے لیکن روح! ـــــ ایں خیال است و محال است و جنوں ـ جس جماعت کی روح اخلاقی زوال کے ایک طویل سرسام اور فکری گراوٹ کے ایک گھناؤنے کوڑھ نے کثیف کی ہو اس میں نئی روح ڈالنا کسی سیاسی تیس مار خاں کے بس کا نہیں ہو سکتا۔ اسے نئی زندگی فقط مصلحین دے سکتے ہیں ـــــ فلاسفہ اور مفکرین بھی نہیں ـــ محض اور صرف مصلحین ـــــ وہ مصلحین جنھوں نے سیاست اور مذہب کے درمیان مصنوعی دیواریں نہ کھڑی کر دی ہوں ـــ جن کا معیار اخلاق اور اصول و نظریات اضافی نہ ہوں ـ جو جغرافی قومیت اور ظلم پرور وطنیت کے تنگ حصار میں بند نہ رہتے ہوں ـ جو مفکر ہوں مگر خالی مفکر نہیں ـ جو مدبر ہوں مگر ان کے تدبر کا محور "انا" نہ ہو۔

مختصر یہ کہ مسٹر کامراج کی اصلاحی تکنک سے ایسی شاندار خوش گمانی کن ثمرات و نتائج کو دیکھ کر کی گئی ہے اس کی کنہ تک ہماری کوتاہ نظری نہیں پہنچ سکی۔ نئی روح تو بڑی چیز ہے۔ ہوا تک ایسے ٹیوب میں بھرنی بہت مشکل ہے جو سوراخوں سے چھلنی ہو چکا ہو۔ مسٹر کامراج اور ان جیسے دس بیس اور رہنما اگر سو پچاس سوراخ ہی بند کر سکیں تو بڑا کارنامہ ہو۔

بہر حال مولانا ممدوح کا اداریہ ملاحظہ فرمائیں۔

نظرات

اب جبکہ شاستری گورنمنٹ کے قیام کے بعد سے ملک میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ شاستری جی اور ان کی گورنمنٹ کو اُن اہم معاملات و مسائل کی طرف متوجہ کریں جو آج ملک کو درپیش ہیں اور جن کے سدھرنے پر ملک کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار اور دارومدار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ پنڈت جی اپنے غیر معمولی اوصاف و کمالات کے باعث دنیا کے اُن بڑے لوگوں میں سے تھے جو تاریخ میں روز روز پیدا نہیں ہوتے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی طویل وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں غلطیاں نہیں کیں، البتہ اُن کی شخصیت اس درجہ بلند اور حاوی تھی کہ وہ ان غلطیوں کے لئے پردہ پوش بن جاتی تھی اور دل و دماغ کے جن اعلیٰ کمالات اور خوبیوں کے مالک تھے وہی بعض اوقات اُن کے اڈمنسٹریشن کی کامیابی کے لئے رکاوٹ ثابت ہوئے انھوں نے اپنی عظیم شخصیت، بلند کردار، انتھک محنت اور بے لوث و مسلسل جد و جہد کے ذریعے ملک کی جو خدمت کی ہے اسے ہندوستان کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بین الاقوامی دنیا میں آج ہندوستان کا جو مرتبہ و مقام ہے اور اندرونی طور پر ملک نے صنعت و حرفت، تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی میں جو ترقی کی ہے ان سب کا شمار پنڈت جی کے کارناموں میں ہونا چاہیئے، لیکن جہاں تک کہ ملک کے اندرونی حالات کا تعلق ہے اُن کو قابل اطمینان ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ یہ موقع اسباب و عوامل پر گفتگو کرنے کا نہیں ہے لیکن کوئی بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ پنڈت جی دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوئے ہیں جب کہ ملک میں رشوت ستانی اور خیانت کا زور ہے اشیائے خوردنی کی قیمتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں، اشیاء میں ملاوٹ کی گرم بازاری ہے اور عوام کو امن و سکون نصیب نہیں ہے، پھر ایک ملک کے استحکام و بقا اور اس کے عروج و ارتقاء کے لئے سب سے مقدم اور ضروری یہ چیز ہے کہ اختلاف مذہب و رنگ و نسل کے باوجود اس ملک کے شہریوں میں مکمل یک جہتی اور قومی یگانگت ہو، ایک کو دوسرے سے بیر نہ ہو، اُن میں اخلاقی نظم و ضبط اور ڈسپلن پایا جائے لیکن یہ چیز ایک ملک کی سالمیت کے لئے جس قدر ضروری اور اہم ہے اسی قدر یہ اس ملک میں مفقود بھی ہے

ملک کو آزاد ہوئے سترہ برس ہو گئے لیکن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہے کہ برابر جاری ہے اور اب عالم یہ ہے کہ ٹھیک اس زمانہ میں جب کہ چین کا خطرہ

سر پر منڈلا رہا ہے اور اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ ملک کے تمام لوگوں میں مکمل یک جہتی ہو، مغربی بنگال، بہار اور اُڑیسہ میں اس قدر ہولناک فسادات ہوئے کہ پچھلے فسادات بھی اُن کے سامنے ماند ہوگئے ۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جس ملک کے عوام اپنے ہی پڑوسیوں پر محض اختلافِ مذہب کی بنیاد پر اس قدر عظیم تباہی و بربادی کا سبب بنیں کیا اُن سے توقع ہوسکتی ہے کہ جب وقت پڑے گا تو وہ اپنے ملک کی طرف سے بہادر انسانوں کی طرح مدافعت کرسکیں گے ؟ پھر جو اڈمنسٹریشن ان فسادات کی روک نہ کرسکے کیا اس سے اُمید ہوسکتی ہے کہ وہ کسی بیرونی طاقت کے حملہ کے وقت ملک میں امن واماں اور ضبط ونظم قائم رکھ سکے گا ؟ حقیقت یہ ہے کہ ملک سازی سے پہلے قوم سازی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس پہلو سے جب ہم ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے ۔ عرب ممالک میں جاکر دیکھئے ! ایک ایک عرب مسلمان اسرائیل کے خون کا پیاسا ہے ۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں برملا اس کا اظہار کرتے ہیں ۔ اسی طرح امریکہ اور برطانیہ اور فرانس ان تینوں ملکوں کے خلاف بھی اُن کے جذبات دوستانہ نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود ان عرب ممالک میں عرب مسلمان، عرب عیسائیوں اور عرب یہودیوں کے ساتھ دوستانہ و برادرانہ تعلقات رکھتے ہیں ۔ فرقہ وارانہ فسادات تو کجا ایک عرب مسلمان کی جرأت نہیں ہے کہ وہ کسی اپنے ہم وطن عیسائی یا یہودی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے اچھے بُرے کہاں نہیں ہوتے، وہاں بھی یقیناً سماج دشمن عناصر ہوں گے جو مذہب کے اختلاف کو اپنی من مانی کرنے کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہوں گے، مگر ان کو ایسا کرنے کا حوصلہ اسی لئے نہیں ہوتا کہ وہ حکومت کے تیور کو پہچانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت قانون شکنی اور دستور کی خلاف ورزی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتی ۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کا حال کیا ہے ؟ یہاں مسلمانوں کے متعلق ہندو فرقہ پروروں کی جارحانہ ذہنیت گذشتہ برسوں میں کم نہیں ہوئی، بلکہ روز بڑھتی اور ترقی کرتی رہی ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رجحانات کو ختم کرنے کے لئے پنڈت جی نے زبان سے سب کچھ کہا مگر عمل کبھی نہیں کیا ۔ ہندو اخبارات نے مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلا، ہندو فرقہ پروروں نے ان کے خلاف زہریلی تقریریں کیں، بے بنیاد الزامات لگائے، سخت پروپیگنڈا کیا اور پھر ان سورماؤں نے بے گناہ مسلمانوں کو قتل وغارتگری کا نشانہ بنایا ۔ یہ سب کچھ ہوا اور مسلسل ہوتا رہا، مگر واہ رے سیکولرزم اور صد آفرین ہماری جمہوریت ! نہ اخبارات سے باز پرس ہوئی نہ اشتعال انگیز مقرروں کو قدغن ! اور نہ مجرموں اور قاتلوں کو سزا ! اور سنیئے ! الٹے گرفتار ہوتے ہیں تو مسلمان اور مقدمات چلتے ہیں تو اُن پر !

غرض کہ شری لال بہادر شاستری کو معلوم ہونا چاہئے کہ بحالاتِ موجودہ یہ ہے ملک کا اڈمنسٹریشن اور یہ ہے قوم میں یک جہتی اور اخلاقی ڈسپلن کا عالم ۔ ملک اور قوم کی تعمیر وترقی فلسفہ کی اونچی دنیا میں پرواز کرنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اصل حقائق کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھا جائے اور پھر جو ان کا مطالبہ ہو اسے عزم وہمت اور طاقت وقوت کے ساتھ پورا کیا جائے ۔

پاکستان اور تجلّی

یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں آٹھ دس یوم کی تاخیر سے پہنچ رہا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عین اسوقت جب یہ مکمل ہوکر پریس جانے والا تھا روزنامہ "پرتاب" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مغربی پاکستان کے گورنر نے اپنی مملکت میں "تجلّی" کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا ہے، اس خبر کو پڑھ کر ظاہر ہے ہمیں چونکنا ہی تھا ۔ چونکنے کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ کاپیاں پریس کے حوالے کرنے سے

قبل خبر کی تصدیق کرلیں تاکہ یہ اگر درست ثابت ہو تو تعدادِ اشاعت اتنی ہی کم کردی جائے جتنی مغربی پاکستان میں کھپتی ہے۔

ہفتے بھر کی تگ و دو کے بعد معلوم بس اتنا ہی ہوسکا ہے کہ خبر بے بنیاد نہیں ہے لیکن ٹھیک ٹھیک نوعیت اب بھی منقح نہیں ہوئی۔ ہندوستانی اخبارات سے تو صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں تجلی کا داخلہ مستقلاً ممنوع قرار پاگیا ہے، لیکن کراچی کے روزنامہ "انجام" میں جس انداز سے خبر چھپی ہے وہ مبہم ہے۔ عنوان ہے:۔

"دیوبند کے رسالہ تجلی کے تمام نسخے ضبط کرلئے گئے"

پھر لکھا ہے:۔

"لاہور۔ ۱۷ر جولائی (پ۔پ) گورنر مغربی پاکستان نے پریس اور مطبوعات آرڈیننس ۶۳ء کے تحت دیوبند کے ماہنامہ رسالہ "تجلی" کے تمام نسخے بحقِ حکومت ضبط کرلئے ہیں۔ حکومت کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ مدیر اور ناشر عامر عثمانی کے تحت شائع ہونے والے اس رسالہ میں جو یشنل پرنٹنگ پریس دیوبند (بھارت) میں چھپا ہے، پاکستان میں قانونی طور پر رائج حکومت کیخلاف زہر اگلا گیا ہے تاکہ حکومت کے خلاف عوام میں منافرت پھیلے"

خبر کا یہ انداز بظاہر اس نوع کا ہے گویا تجلی کی کسی خاص اشاعت کے نسخے ضبط کئے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں ضروری نہیں کہ اگلی اشاعتیں بھی ممنوع قرار پاجائیں۔

لیکن خبر میں "ماہ اشاعت" نہ پایا جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ابہام دراصل قانون کے لگے بندھے اندازِ بیان نے پیدا کیا ہے ورنہ مقصود یہی ہے کہ اب کسی بھی اشاعت کا کوئی نسخہ مغربی پاکستان میں داخلے کا مجاز نہ ہوگا۔ شاید ہندوستانی اخبارات نے اسی لئے واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ تجلی کا داخلہ مغربی پاکستان میں ممنوع قرار پاگیا۔

کچھ بھی ہو۔ فی الحال تو ہندوستانی قارئین کی خدمت میں یہ پرچہ حاضر ہی ہے۔ پاکستان کا مسئلہ مزید تحقیق کے بعد طے ہوگا۔ وللّٰہ عاقبۃ الامور۔

آیات بیّنات تردیدِ شیعہ میں ایک عظیم کتاب۔ جس میں خود شیعہ مذہب کی کتابوں اور ان کے علماء کے اقوال سے صحابہؓ کے فضائل وغیرہ کو ثابت کیا گیا ہے۔ معرکے کے مختلف فیہ مسائل میں بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ دو جلدوں میں کامل اٹھارہ روپے۔

تحفۂ اثنا عشریہ رفض و شیعیت کے رد اور مسلک اہلِ سنت کے اثبات میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی یہ کتاب بھی زمانے بھر میں مشہور ہے۔ مفصّل، مدلّل اور ایمان افروز۔ مجلّد بارہ روپے

المنجد (اردو) دنیا کی مشہور ترین عربی لغت اصلاً یہ عربی سے عربی میں ہے لیکن اردو دانوں کی خاطر اس کا اردو ترجمہ کردیا گیا ہے۔ گویا ہر عربی لفظ کا مفہوم اردو میں۔ اشیاء کی صدہا تصاویر سے مزیّن۔ خوب ضخیم۔ مجلد تیس روپے۔

تجلی کے دو شاندار نمبر

جو حضرات ان نمبروں کو نہ دیکھ پائے ہوں ان کیلئے مسرت بخش پیش کش

خاص نمبر ۱۹۶۳ء نوع بہ نوع دلچسپیوں اور علمی جواہر پاروں کا دلکش مجموعہ۔ مدیر تجلی کے قلم سے متعدد اہم اور نازک سوالوں کے مدلّل و مفصّل جوابات۔ آغازِ سخن میں ایک عجیب حادثے کی تحیّر خیز کہانی۔ صفحات سو سے زاید۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ڈاک نمبر ۱۹۶۳ء یہ تو ڈاک نمبر ہی ٹھیرا۔ علم و تفقہ اور انشاء کے حسن سے بھرپور دلچسپ سوالات کے دلنشیں اور بے لاگ جوابات۔ پھر ملّا بھی ایک گڑیا مفتی کے روپے میں! سوا روپیہ

مکتبہ تجلی دیوبند یوپی

جہنم کی ابدیت

گزشتہ شمارے میں "کفار کے انجام" پر بحث کرتے ہوئے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی رحؒ کی "سیرۃ النبیؐ" کا بھی ذکر آیا تھا اور ہم نے عرض کیا تھا کہ انھوں نے بعض علماء کی پیروی میں جہنم کے فنا ہو جانے کا جو خیال قائم کیا ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح رائے جمہور ہی کی معلوم ہوتی ہے کہ جہنم کبھی فنا نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک ندوی فاضل کا والا نامہ موصول ہوا ہے جس سے واضح ہوا کہ خود مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی بعد میں اپنے خیال سے رجوع فرما لیا تھا اور دوام جہنم کے قائل ہو گئے تھے۔ اس خط میں رجوع کی عبارت کے لئے "تذکرۂ سلیمان" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ہم نے احتیاطاً تذکرہ سلیمان خود بھی دیکھ لیا ہے۔ فالحمد للہ۔ (ع)

مکرمی جناب مولانا عامر صاحب عثمانی السلام علیکم و رحمۃ اللہ

اُمید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔ اس ماہ کے تجلی میں جناب نے فنائے نار کے مسئلے پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسکو پڑھ کر صد درجہ خوشی ہوئی البتہ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو غلط فہمی ہو گئی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کو بھی واضح کر دیا جائے۔

معارف جنوری ۱۹۴۳ء میں سید صاحب علیہ الرحمۃ نے رجوع و اعتراف کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا اس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ :-

"فنائے نار کے مسئلے میں پہلے حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی پیروی میں کچھ لکھا گیا' بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آگیا۔ وما توفیقی الا باللہ۔"

(منقول از تذکرہ سلیمان صـ۱۴۴)

اسی "رجوع و اعتراف" کے تحت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بعض دوسرے مسائل پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے۔

امید ہے کہ حضرت سید صاحب کی اس وضاحت سے ناظرین تجلی اور جناب کی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے گا۔ فقط

عبید اللہ کوٹی ندوی
حال مقیم دار العلوم دیوبند

دُرِّ نجف

ایک کامیاب سرمہ جسکی مانگ امریکہ' افریقہ اور ماریشس (فرانس) تک پہنچ چکی ہے مریض اور صحت مند دونوں طرح کی آنکھوں کے لئے مفید۔

دار الفیض رحمانی دیوبند (یوپی)

مستقل عنوان

تجلی کی ڈاک

کفار و مشرکین کے اعمال کی حیثیت

سابقہ اشاعت میں ایم۔ ایم منصورانی کے سوال کی شق نمبر ۱ کا جواب دیا گیا تھا۔ شق نمبر ۲ کا جواب اب دیا جا رہا ہے۔ احتیاطاً یہ سوال کی شکل میں پھر نقل ہے:-

سوال ۲:- کافروں اور مشرکوں کے نیک اعمال کا بدلہ دیا جائے گا یا نہیں؟ پچھلے دنوں پاکستان کے مشہور عالم مولانا عبد القدوس صاحب ہاشمی یہاں سہارنپور تشریف لائے تھے۔ ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین کو بھی ان کے نیک اعمال کا بدلہ دے گا تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب ۲:-

مولانا عبد القدوس ہاشمی کا ارشاد گرامی مجمل ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ جو کفار و مشرکین اچھے اعمال و اطوار رکھتے ہیں انھیں آخرت میں وہ سزا نہیں ملیگی۔ جو برے اعمال و اطوار رکھنے والے کفار و مشرکین کا نصیبہ ہے تو یہ بات بالکل درست ہے۔ جس طرح جنت کے مختلف درجات و طبقات ہیں اسی طرح جہنم بھی مختلف کلاسوں اور درجوں میں بٹا ہوا ہے۔ کفار و مشرکین کو دوزخ میں تو بہرحال جانا ہے لیکن ایک ہی درجے میں نہیں بلکہ ان کے اعمال و اطوار جس درجے میں اچھے اور برے، ظالمانہ اور عادلانہ ہوں گے اسی کے تناسب سے درجات جہنم بھی دیئے جائیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ فرعون و ابوجہل اور ابن اُبی جیسے ائمہ کفر کے لئے جو عذاب ہے وہی عام کافروں کو بھی دیا جائے۔ بداطوار کافر کی مثال کریلے اور نیم چڑھے کی ہے۔ خوش اطوار کا فریم چڑھا نہیں مگر کفر کی کڑواہٹ اس میں بہرحال ہے لہٰذا بخشا تو نہیں جائیگا مگر تعذیب میں نرمی ضرور برتی جائے گی۔

اور اگر مولانا ہاشمی کا مطلب یہ ہو کہ اچھے کام کرنے والے کافروں اور مشرکین کے اعمال نیک کا بدلہ نجات اور فردوس کی شکل میں بھی مل سکے گا تو اس کے ہم قائل نہیں کیونکہ ہمیں قرآن و حدیث اس کی اطلاع نہیں دیتے۔ قرآن میں کس قدر بار اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے الفاظ آئے ہیں یعنی پہلے ایمان پھر عمل نیک۔ سورۂ نساء میں اور بھی تصریحی انداز اختیار فرمایا گیا۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا[1]۔ کون نہیں جانتا کہ انعام کا جو اعلان کسی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا جائے وہ تبھی مل سکتا ہے جب یہ شرط بھی پائی جائے۔ نیک عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرماتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کھول دیتے ہیں کہ یہ نیک عمل کرنے والا مومن ہونا چاہیئے کافر نہیں۔ پھر بھلا ہم کس منھ سے اور کس بنیاد پر یہ کہنے کی جرأت کریں کہ نیک عمل کرنے والا چاہے کافر و مشرک ہی ہو جنت میں چلا ہی جائے گا۔ جنت ہماری نہیں اللہ کی ہے اور اس میں بھیجنے نہ بھیجنے کے اختیارات کسی اور کو نہیں اسی کو حاصل ہیں۔ وہ جنت میں داخل کرنے کے لئے ایک دو دس بیس نہیں اس سے بھی زیادہ بار یہ تنبیہ فرما دیتا ہے کہ ایمان پہلے، عمل صالح اس کے بعد ۔۔۔ تب کہیں جنت میں داخلہ دیا جائے گا تو بتایئے

---

[1] جس کسی نے بھی اچھے کام کئے چاہے وہ مرد ہو یا عورت ۔۔۔ اگر وہ مومن بھی ہے تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

ہم کس لاؤلشکر کے بل پر یہ اطمینان اہل کفر کو دلائیں کہ ایمان چاہے نہ لاؤ مگر عمل اچھے کر لو ہم تمھیں جنت دلوا ہی دیں گے۔

نہیں بھائی۔ ہمارے بس میں تو یہ ہے نہیں۔ کوئی اور صاحب اپنے زعم میں اس کا بل بوتا رکھتے ہوں تو وہ جانیں۔ طبیعت ہماری بھی یہی چاہتی ہے کہ اللہ کی کم سے کم مخلوق جہنمی بنے اور زیادہ سے زیادہ بندے جنت کا لطف اُٹھائیں مگر طبیعت کے چاہنے سے معتقدات کا محل تو نہیں بنتا۔ عقیدہ یہی ہے اور یہی ہر مسلمان کا ہونا بھی چاہئیے کہ کافر و مشرک ہر حال میں جنت سے محروم رہے گا۔ آگے اللہ کی قدرت کاملہ جو چاہے کرے کون ہے جو اس کی مرضیات میں حائل ہو سکے اور کس کی مجال ہے جو اسے کسی بھی معاملہ میں ٹوک سکے۔

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کا کردار کیا رہا ہے۔ انھوں نے کفار و مشرکین کے مقابلے میں اپنے بھتیجے کی مدد جس جرأت و استقلال اور تسلسل کے ساتھ کی ہے اسے دیکھ کر تو جی چاہتا ہے کہ ان کے پیروں کو بوسہ دیں۔ ان پر دل و جان تصدق کر دیں۔ بھلا اس حسن عمل سے بڑھ کر لائق انعام اور بیش قیمت عمل کیا ہوگا کہ اللہ کے سب سے بڑے پیغمبر اور کائنات کے سب سے گرانمایہ وجود کی حمایت میں ایک شخص مردانہ وار سینہ سپر ہو جائے اور پھر اس کی حمایت بے نتیجہ بھی نہ رہی ہو بلکہ ظاہری سطح پر نہایت بار آور اور بے حد مفید ثابت ہوئی ہو۔ علاوہ ازیں ابو طالب حضورؐ کی رسالت اور اسلام کی حقانیت کے دل سے منکر بھی نہیں تھے۔ ان کے جو مکالمے معتبر کتب میں ملتے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے امین و صادق چچا[؟] کی دیانت و صداقت پر یقین تھا

اس کے باوجود ۔۔۔ احادیث صحیحہ ہی سے غیر مشتبہ طور پر اطلاع ملتی ہے کہ مغفرت ان کی بھی نہ ہو سکے گی۔ حضورؐ سے بعض صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا ابو طالب کے تمام اعمال ضائع گئے؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ نہیں ضائع نہیں گئے۔ انھیں ان اعمال ہی کے صلے میں دوزخ کے مہیب ترین طبقات سے دُور رکھا جائے گا اور ایسے طبقے میں ڈالا جائے گا جہاں آگ ان کے پورے جسم کو محیط نہیں ہوگی بلکہ گھٹنوں تک رہے گی (او کما قال ؐ)

بولئے اس کے بعد کیا گنجائش ہے لب ہلانے کی۔

ہمارے آقاؐ تو شکر گذاری اور احسان شناسی کے اس اعلیٰ مقام پر فائز تھے جس سے زیادہ کا تصور بھی ممکن نہیں باوجود معصوم ہونے کے اور باوجود اس اعلان خداوندی کے کہ اے پیغمبر ہم نے تیرے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف کئے" ۔۔۔ جن کے پیر عبادت کرتے کرتے سوج جاتے ہوں، جن کی روح ہر لمحہ ایک ہی آہنگ سرمدی میں اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا کا نغمہ دہراتی رہتی ہو اور جو اپنے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے کافر و مشرک تک کا قولاً عملاً شکریہ ادا کرنے اور صلہ دینے میں حیرتناک حد تک فیاض ہو وہ بھی اگر اپنے محسن چچا ابو طالب کیلئے جنت اور مغفرت کی بشارت نہیں دے سکتا بلکہ عذاب ناری کی اطلاع دیتا ہے تو پھر ابو طالب سے بہتر کافر اور کون ہوگا جس کے بخشے جانے کی توقع کی جا سکے۔ ہاں برابر بھی امکان کفار کی مغفرت کا ہوتا تو حضورؐ آخر وقت تک نہایت حسرت اور دلسوزی کے ساتھ اپنے شفیق و کریم چچا سے یہ نہ کہتے کہ ۔۔۔ "چچا اب بھی اسلام قبول کر لیجئے تاکہ میں اللہ کی جناب میں آپ کی شفاعت کر سکوں! ۔۔۔ آپ جانتے ہیں آخر وقت کا اسلام شرعاً قبول نہیں۔ اس کے باوجود اللہ کا رسولؐ اپنے محسن چچا کی مغفرت کا اس حد تک مشتاق ہے کہ اگر آخر وقت میں بھی چچا اسلام کا اقرار کرے تو شمہ برابر امکان ہے کہ سہارے ہی اللہ کا رسولؐ اپنے رحیم و کریم رب کے آگے عرض و معروض کی پیشانی ٹیک سکے ۔۔۔ اس سے ثابت ہوا کہ بغیر قبول اسلام کے تو اللہ کے حضور عرض و معروض کی بھی گنجائش نہیں۔ ہاں برابر بھی امکان مغفرت تسلیم کر لیا جائے تو نعوذ باللہ اس منطقی نتیجے کو انگیز کرنا ہوگا کہ حضورؐ ناشکر گذار اور احسان فراموش تھے۔ جس چچا نے ایسی شاندار حمایت کی اس کے بارے میں یہ تک نہیں کہتے کہ میں خدائے رحیم سے اس کی مغفرت کی گذارش کر دوں گا بلکہ عذاب جہنم ہی کی

بشارت سناتے ہیں ـــ چاہے وہ عذاب ہلکے قسم کا ہو۔

ایک ذرا سی بات اور سمجھ لینے کی ہے۔ اچھے اور بُرے اعمال کا بدلہ فقط آخرت ہی میں ملنا ضروری نہیں وہ دنیا میں بھی مل سکتا ہے اور ملتا ہے۔ کافر و مشرک کو اللہ تعالےٰ اگر اس کے اچھے اعمال کا صلہ دنیا ہی میں دیدے تو یہ وسوسہ بھی ختم ہوا کہ اس کے اعمال بالکل ہی ضائع ہوگئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بھر میں آج کیا کچھ عروج اور غلبہ کفار و مشرکین کو حاصل ہے۔ کیسی کیسی مادی نعمتیں اور آسائشیں میسر ہیں۔ اسے اجر اور بدلے ہی کے زمرے میں رکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کی نعمتیں آخرت کی نعمتوں جیسی نہیں۔ دونوں کی کمیت اور کیفیت دونوں ہی میں زمین و آسمان کا فرق ہے مگر ایک کھلے باغی اور نافرمان کو دنیا کی کونسی حکومت ان انعامات سے نواز سکتی ہے جو صرف وفاداروں ہی کے لئے مخصوص ہوں۔ کفر اور شرک اُس آئین و دستور سے انحراف اور انکار کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے بھیجتے رہے اور جسے آخر میں ایک تکمیلی اور دوامی شکل دیکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بھیجا۔ جو لوگ کھلم کھلا اس آئین و دستور کو جھٹلاتے ہیں' اسے نادرست سمجھیں' اس کی تعلیم و ہدایت سے بالکل اُلٹ عقائد رکھیں انھیں خدا کا باغی نہیں تو کیا وفادار کہا جائے گا۔ باغیوں کے لئے دنیاوی حکومتوں کے پاس تو رعایت اور انعام کا کوئی خانہ ہی نہیں۔ اللہ کا بے پایاں احسان سمجھیے کہ وہ اپنے باغیوں کو بھی خاصی ڈھیل دیتا ہے اور ان کے جن اچھے اعمال کی روح ایمان سے خالی ہونے کے باعث کوئی قیمت ہی نہیں ان کا بھی کچھ نہ کچھ صلہ دے ہی دیتا ہے۔ اب کوئی یوں چاہے کہ انھیں وہ انعام بھی دے دیا جائے جو عقل و نقل ہر اعتبار سے وفاداروں ہی کا حصّہ ہونا چاہئے تو چاہنے پر بندش کوئی نہیں لگا سکتا مگر چاہنا کسی واقعے کی کی ظہور میں آجانے کی ضمانت بھی نہیں!

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ ـ تو کیا ہم فرمانبرداروں اور نافرمانوں

کَالْمُجْرِمِیْنَ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ۔ اَمْ لَکُمْ کِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ اِنَّ لَکُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ (القلم)

کو برابر کردیں گے ـــ ارے کیا ہوا ہے تمھیں کیسے (اوندھے) فیصلے کرتے ہو۔ کیا تمھارے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جسے تم پڑھ لیتے ہو اور اسمیں وہی مل جاتا ہے جو تمھیں پسند ہو!

❖ ❖ ❖ ❖

ہاتھ پیر چومنا

سوال ۴ :- از:- محمد اعظم مسلم - محبوب نگر۔

میرے ایک دوست پرچہ القدیر ماہ رجب ۱۳۸۳ھ کا صفحہ ۹ بتلاتے ہوئے کہنے لگے کہ دیکھئے قدم بوسی اور دست بوسی کے جواز میں احادیث موجود ہیں۔ پھر آپ لوگوں کو خواہ مخواہ روکتے ہیں اور یہاں کی اکثریت ان احادیث کی وجہ سے پھر اُس طرف راغب ہو رہی ہے۔ یہ احادیث کہاں تک صحیح ہیں۔ آپ تکلیف فرما کر ہم جیسے کم علم لوگوں کی تشفی فرما کر ممنون فرمائیے۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی اس قسم کے سوالات تجلّی میں شائع ہو چکے ہوں۔ چونکہ ہم دیرینہ قارئین میں سے نہیں ہیں۔ ہمارے یہ دوست فرماتے ہیں کہ مولانا عامر صاحب کے پاس اس مسئلے میں کسی قسم کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے علم میں آچکا ہے کہ آپ "تعبیر کی غلطی" پر تبصرہ کی وجہ سے عدیم الفرصت ہیں۔ براہ کرم اپنی خاص مصروفیات کے باوجود بھی ناچیز کی اس تحریر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے پر آئندہ آنے والے تجلّی میں مدلل جواب شائع فرمائیے تو عوام الناس کو کافی فائدہ حاصل ہوگا۔ (رسالہ القدیر رجب شعبان ۱۳۸۳ھ صفحہ ۹)

کیا دست بوسی اور قدم بوسی جو رکوع اور سجود سے مشابہ ہے حرام نہیں؟ سنت کو حرام کہنا تو آپ ہی کو مبارک۔ اتنی بڑی جرأت آپ ہی کے شایانِ شان ہے

جناب! حضرتؐ کا فرمانا' حضرتؐ کا کوئی کام کرنا' حضرتؐ کے سامنے کوئی کام ہوا اور آپؐ نے اسکو باقی رکھا اس سے منع نہ کیا یہ سب سنت ہے۔ اب آپ

سماعت فرمائیں۔

۱۔ امام بخاری ادب مفرد میں وزاع بن عامر سے روایت کرتے ہیں۔ کہا ہم مدینے میں پہنچے تو کہا گیا وہ رسول اللہؐ ہیں۔ ہم نے ان کے دونوں ہاتھ پاؤں پکڑے اور بوسہ دیا۔

۲۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی میں صفوان بن عسالؓ سے مروی ایک بڑی حدیث میں ہے کہ دو یہودیوں نے حضرتؐ سے بعض سوال کئے اور آپؐ نے انکے جواب دیئے۔ قَالَ فَقَبَّلُوْا یَدَیْہِ وَرِجْلَیْہِ۔ صفوان کہتے ہیں ان دونوں نے حضرت صلعم کے دونوں ہاتھ اور پیر دونوں پیر کو بوسہ دیا۔

۳۔ وفد بنی عبدالقیس کے ایک رکن زارع کہتے ہیں کہ ہم مدینے میں داخل ہوئے تو اپنی سواریوں سے چھٹنے لگے۔ پھر رسول صلعم کے دست و قدم مبارک کا بوسہ لیا۔ (ابوداؤد۔ مشکوۃ)

۴۔ عبداللہ بن عمرؓ سے ابوداؤد نے روایت کی ہے ہم لوگ جنگی مہم (سریے) سے جب مدینہ واپس ہوئے (سریا کا رہے گفتگو کی) پھر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے اور آپؐ کے ہاتھوں کا بوسہ دیا۔ (مشکوۃ)

ان عذاب جاں موحدوں کو کون کہاں تک سمجھائے۔ روحانیت کا راستہ چلتے تو ارواح کا کچھ حال جانتے۔ جس چیز کا علم نہیں تجربہ نہیں اس کے متعلق رائے قائم کر لینا مسلمانوں کو مشرک و کافر کہنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ علماء اور بزرگوں کے حالات پڑھو تو تم کو بھی علم ہو جائے گا۔

واضح ہو کہ یہ لوگ اپنے شیخ کو حضرت قبلہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف حضرت کہتے ہیں۔

الجوابؔ:۔

اس طرح کے مسائل پر ہم تقریباً بارہ سالوں تک لکھتے رہے ہیں اب کچھ عرصے سے یہ سلسلہ اس لئے بند ہے کہ ملکی و ملی حالات بڑے نازک دور سے گذر رہے ہیں اور سوال زندگی اور موت کا درپیش ہے۔ اس وقت آپس کے فروعی اختلافات میں الجھے رہنے کا نہ تو دماغ ہے اور نہ موقع۔ پھر بھی آپ اس نوع کے مسائل کو سمجھنا ہی چاہیں تو تجلی کا قابل ملاحظہ فرمالیں جدید نہ ملے تو رد بدعت کی وہ کتابیں مطالعہ فرمائیں جن کے اعلانات تجلی میں آپ نے دیکھتے ہیں۔ جو لوگ دو چار روایات دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے علم شریعت کے بحر ذخار کو کھنگال ڈالا اور گہرائیوں کے تمام اسرار ان پر منکشف ہو گئے ان کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس نے کبھی پہاڑ نہیں دیکھا اور یہ سمجھ کر خوش ہوتا رہا کہ مجھ سے اونچی کوئی چیز نہیں۔

بحث کی خاطر نہیں بلکہ تفہیم و تذکیر کے طور پر ہم جواباً کچھ عرض کرتے ہیں:۔

اولاً تو یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہاتھ پیر چومنا ایک ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ دو مسئلے ہیں۔ ہاتھ چومنا الگ اور پیر چومنا الگ۔ دونوں کا حکم الگ الگ ہے دونوں کو مخلوط نہیں کرنا چاہیئے۔

ثانیاً یہ کہ کسی شے کا جائز ہونا اور چیز ہے اور سنت ہونا اور۔ سنت تو اعلیٰ درجے کی شے ہے۔ اس سے نچلا درجہ مستحب اور مندوب کا ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر جائز چیز سنت تو در کنار مستحب یا مندوب ہی ہو۔ شریعت کے دائرے میں صرف اسی چیز کی اہمیت نہیں کہ کیا جائز ہے اور کیا حرام بلکہ بڑی اہمیت اس چیز کی بھی ہے کہ جواز و حرمت کا درجہ اور ٹھیک ٹھیک پر پیچ کیا ہے۔ یہ فرض، واجب، سنت، نفل، مستحب اور مندوب جیسی اصطلاحیں اسی لئے تو وضع کی گئیں کہ مباح امور کی صحیح پوزیشن متعین ہو سکے اور کراہت تنزیہی، کراہت تحریمی، حرام اور احرم الحرام جیسی اصطلاحیں بھی اسی مصلحت پر مبنی ہیں۔

ثالثاً یہ کہ کونسی روایت کس درجے کی ہے اور اس سے

کون کون سے مسائل و احکام نکلتے ہیں یہ طے کرنا ایسے اہلِ علم کا کام ہے جنھیں اجتہاد کی صلاحیت حاصل ہو۔ ان کی نظر روایات کے پورے ذخیرے، قرآن کی تمام آیات اور سیرت و آثار کے تمام دفتر پر ہو۔ وہ دین کے مزاج اور شریعت کے بنیادی تقاضوں کو سمجھتے ہوں۔ نہ یہ کہ ہر شخص جس کا جی چاہے حدیث کی کوئی کتاب اٹھا کر اجتہاد کا علم بلند کرنے لگے اور محض اٹکل اور تخمین کے سہارے لوگوں کا دین بگاڑے۔

• ان اصولی باتوں کے بعد روایات پر نظر ڈالئے جو سوال میں مندرج ہیں۔ چوتھی روایت میں صرف ہاتھ چومنے کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان روایات کو پیش کرنے والا ہاتھ اور پیر چومنے کو ایک ہی مسئلہ تصور کرتا ہے۔ حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے۔ ہاتھ چومنے کی ہیئت میں سجدے اور رکوع سے کوئی کوئی مشابہت نہیں حالانکہ پیر چومنے میں کھلی مشابہت ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ سورج کے طلوع و غروب کے وقت نماز کو مکروہ قرار دیا گیا کیونکہ اس میں معنوی مشابہت سورج پرستوں سے تھی۔ اسی طرح قبر کو سامنے رکھ کر نماز ممنوع قرار دی گئی۔ کیونکہ اس میں عبادت لغیر اللہ کا ایہام تھا۔ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ آج سورج پرستی کا وجود نہیں۔ پھر ساری دنیا خوب جان چکی ہے کہ مسلمان اللہ کے لئے نماز پڑھتے ہیں سورج یا چاند یا کسی انسان کے لئے نہیں۔ علاوہ ازیں آپ مسجد میں یا اپنے گھر کے کونے میں نماز پڑھ رہے ہوں تو کوئی بھی دیکھنے والا ایسا نہیں ہوتا جو یہ وہم اور شبہ کر سکے کہ آپ سورج کی پوجا کر رہے ہیں اس کے باوجود طلوع و غروب کے وقت نماز آج بھی مکروہ ہے اور ہمیشہ مکروہ رہے گی حتیٰ کہ مزید احتیاط کے لئے صبح اور عصر کے فرضوں کے بعد نوافل کی ممانعت ہی کر دی گئی چاہے طلوع و غروب میں کتنا ہی وقت باقی ہو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ کسی بھی طریق کفر سے ادنےٰ سی مشابہت بھی شریعت کو کسی حال میں گوارا نہیں ہے یہاں تک کہ جن صورتوں میں شبہ کا احتمال نہیں پایا جاتا ان میں بھی ممانعت کا قانون جوں کا توں باقی رہتا ہے۔

پھر بتائیے قدم بوسی کی شکل تو ہر آئینہ اور ہر زمانے اور ہر مقام میں سجدے اور رکوع سے مشابہت رکھتی ہے سورج پرستی سے کہیں زیادہ شدت، صراحت اور قوت کے ساتھ اس میں غیر اللہ کی عبادت کا اشتباہ موجود ہے۔

اس سلسلے میں لوگ نیتوں کی بحث چھیڑتے ہیں۔ یہ قانون کے مزاج سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پیروں کو بوسہ دینے والا انھیں خدا نہیں سمجھ رہا لیکن ہم یہ بھی تو جانتے ہیں کہ طلوع یا غروب کے وقت نماز پڑھنے والا سورج کی پوجا نہیں کر رہا۔ پھر بھی شریعت ان اوقات میں نماز کو منع کرتی ہے اور ہماری نیت کا حسن اس کے حکم کو منسوخ نہیں کرتا تو قدم بوسی کے باب میں ہمارے حسنِ نیت سے حکم ممانعت کیسے منسوخ ہو جائے گا جب کہ قدم بوسی سورج پرستی کے احتمال سے کہیں زیادہ غیر اللہ کی عبادت کا اشتباہ رکھتی ہے۔

لہٰذا کسی بھی غیر جانب دار اور انصاف پسند شخص کو اس میں شک نہیں ہونا چاہئے کہ قدم بوسی اور دست بوسی میں بیّن فرق ہے۔ قدم بوسی ایسے نمایاں خطرے پر مشتمل ہے جس کی وجہ سے اسے اسی طرح ممنوع قرار پانا چاہئے جس طرح طلوع و غروب کے وقت یا قبر کو سامنے رکھ کر نماز ممنوع ہے۔ دست بوسی کا یہ معاملہ نہیں لہٰذا اسے ممنوع قرار دینا مشکل ہے۔

پہلی اور تیسری روایت میں اگرچہ قدم بوسی کا ذکر موجود ہے لیکن خود یہی روایتیں یہ بھی واضح کر رہی ہیں کہ یہ قدم بوسی کرنے والے مسلمان پہلے سے صحابی نہیں تھے بلکہ آج ہی انھیں حضورؐ کا شرف دیدار حاصل ہوا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اپنی حیات کفر میں جس قسم کی معاشرت اور آداب و رسوم کے یہ خوگر تھے ان کا اثر رفتہ رفتہ ہی جاتا اور تدریجاً ہی یہ اسلامی رنگ میں رنگے جاتے۔ انھیں یہ کیا معلوم کہ اظہار عقیدت و محبت میں پیر چومنے کا جو طریق ان کے معاشرے میں مروج ہے وہ اسلامی اعتبار

سے پسندیدہ ہے یا مکروہ - وہ آئے اور قدرتاً ان سے وہی طریقہ ظاہر ہوا جس کے وہ عادی تھے - اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ قدم بوسی سنت تو سنت مستحب اور مندوب بھی ہے - رہا حضورؐ کا فوری طور پر معترض نہ ہونا تو اس کا سبب بھی ایک معمولی ذہن کا آدمی ادنیٰ غور کے ساتھ معلوم کر سکتا ہے - اول تو اسلام ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا تھا تدریجی مراحل چل رہے تھے - آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بہت دنوں تک تو شراب اور سود کی بھی ممانعت نہیں آئی پھر یہ کیسے سمجھ لیا کہ کچھ نئے مسلمانوں کی وقتی قدم بوسی ہمیشہ کے لئے قدم بوسی کو "سنت" کے دائرے میں رکھدے گی جب کہ شریعت اپنے تکمیلی مراحل میں طلوع و غروب کے وقت نماز تک کو منع کرنے والی ہے -

دوئم حضورؐ جانتے تھے کہ یہ لوگ نئے ہیں رفتہ رفتہ اسلام کو سمجھ جائیں گے اور حیاتِ کفر میں جن رسوم و آداب کے عادی رہے ہیں وہ خود بخود اصلاح پذیر ہوتی جائیں گی - اس وقت ان کی دلشکنی مناسب نہیں - آپ اس واقعہ کو یاد کریں جب عیسائیوں کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں باریاب ہوتا ہے اور اس کی طرف سے درخواست کی جاتی ہے کہ آج ہماری اتوار کی نماز کا دن ہے تو حضورؐ انہیں مسجد نبوی میں نماز کی اجازت دیدیتے ہیں - یہ اسی لئے تو تھا کہ ان کی دل شکنی نہ ہو ورنہ کیا اس اسوے سے ہم یہ قانون اخذ کر سکتے ہیں کہ جب کبھی کوئی کافر ہم سے ہماری مسجد میں اپنی عبادت کا اذن مانگے ہم اسے اذن ضرور دیدیں؟

نمبر۲ روایت میں یہودیوں کا ذکر ہے - تعجب ہے ان لوگوں کے دماغوں کو کیا ہوا جو قدم بوسی کے مسنون ہونے کی دلیل میں اس روایت کو بھی کھینچ لاتے ہیں - معمولی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہودیوں کا فعل ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتا اور حضورؐ نے اگر اس فعل پر نکیر نہیں کی - یعنی انھیں ٹوکا نہیں تو اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ فعل اسلامی اعتبار سے پسندیدہ تھا - بس عقیدہ چونکہ یہ گھڑ لیا گیا ہے کہ بزرگوں کے پیر چومنا بڑا اچھا کام ہے لہذا الٹی سیدھی دلیل بازی کی جارہی ہے -

---

ازراہ اختصار ہم بس ایک ہی دلیل ایسی پیش کئے دیتے ہیں جو ہر سلیم الطبع اور حق پسند کے لئے کافی شافی ہوگی -

آپ کو معلوم ہے صحابۂ کرام رضؓ نیکیوں کے کس قدر دلدادہ تھے - سنت تو بڑی چیز ہے وہ معمولی سے معمولی مستحب اور مندوب کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے - اگر بزرگوں کے پیر چومنا واقعی مسنون تھا تو حضورؐ سے بڑا بزرگ کون ہوگا اور صحابہؓ سے بڑھکر سنتوں کی گرویدہ جماعت چشم فلک نے کب کبھی دیکھی ہوگی - اس صورت میں تو صحابہؓ کے حالات میں ہمیں جگہ جگہ نظر آنا چاہئے تھا کہ حضورؐ کے ہاتھ اور پیر چومے جا رہے ہیں - خاص طور پر خلفائے راشدین اس عمل میں آگے آگے نظر آتے - لیکن نظر یہ آرہا ہے کہ کسی بھی صحابی کو اس سے مطلق دلچسپی نہیں - صحابہؓ کے حالات پر متعدد کتابیں موجود ہیں - خصوصاً بعض صحابہؓ کی تو بڑی مفصل سوانح عمریاں آپ کے ہاتھوں میں ہیں - علاوہ ازیں محدثین نے آثار کے عنوان سے ان کے تمام وہ اقوال و اعمال ذکر کر دیئے ہیں جن کا تعلق دین سے ہے - ہزار پانسو نہیں - سو پچاس نہیں دس بیس بھی نہیں - فقط دو چار صحابیوں کو دکھلا دو جنھیں اس فعل سے دلچسپی رہی ہو - اگر دو چار صحابی بھی کبھار ایسا کرتے نظر آتے تو اگرچہ اس سے اس فعل کا سنت ہونا ثابت نہ ہوتا مگر جواز تو ثابت ہو ہی جاتا لیکن جب صف اوّل کے صحابہؓ میں کوئی بھی اس فعل کو ایک بار بھی کرتا نظر نہیں آتا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ مستحب اور پسندیدہ ہونا تو درکنار یہ فعل صحابہؓ کے نزدیک حلال ہی نہیں تھا -

سوچئے - اگر قدم بوسی واقعۃً کچھ بھی محمود عمل ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ کائنات کے سب سے بڑے انسان کی قدم بوسی وہ لوگ نہ کرتے جن سے بڑھ کر اپنے مرشد اور رہنما سے محبت کرنے والا گروہ آج تک پیدا ہی نہیں ہوا - کرتے اور ہزار بار کرتے - نہیں کیا تو بلا ادنیٰ ابہام ثابت ہو گیا کہ اس فعل میں کوئی حسن نہیں کوئی عمدگی نہیں -

رہا جواز کا معاملہ - تو اگرچہ طلوع و غروب اور

قبر والی مثالوں سے بالکل ظاہر ہے کہ جواز کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ پھر ایسی مثالیں شریعت میں دو چار نہیں بلکہ سیکڑوں ہیں تاہم جواز مان ہی لیں تو حقیقۃً گفتگو صرف جواز ہی کی نہیں ہے بلکہ جو لوگ جواز کی دلیلیں لاتے ہیں ان کے حلقوں میں یہ فعل ایک مستقل ادب اور معمول بنا ہوا ہے۔ گویا وہ جواز کی آڑ میں اس عمل کو محمود و مستحسن ثابت کرنا چاہتے ہیں حتٰی کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں وہ نہایت بے دانشی کے ساتھ اس پر سنت کی اصطلاح بھی چسپاں کر رہے ہیں۔ پھر بتائیے بات بنے تو کیسے بنے۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ ہاتھ چومنا بجائے خود ممنوع نہیں ہے لیکن اسے مستقلاً رسم اور معمول بنا لینا شریعت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ پیر چومنا بجائے خود ممنوع ہے۔ اس میں رکوع سجود سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث و آثار کی کتابوں میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی پختہ کار صحابی نے حضورؐ کے پاؤں چومے ہوں۔ اس کے باوجود اگر کوئی کہتا ہے کہ قدم بوسی محمود و مستحسن ہے تو اس کی بے دانشی اور فسادِ ذہنی کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔ دراصل جب قوتِ شامہ بدبو کی عادی ہو جائے تو نفاست و نظافت کا شعور ختم ہو جاتا ہے اور اچھی خاصی متعفن چیزوں سے آدمی کو کوئی کراہت محسوس نہیں ہوتی۔ مروّجہ تصوف میں عرصۂ دراز سے ایسے اُمور شامل کر لیے گئے ہیں جو اپنے مزاج اور ذہنی پس منظر کے اعتبار سے مشرکانہ ہیں۔ ان کا عادی ہو جانے کے باعث تصوّف کے اکثر حلقہ بگوشوں کو غلاظتِ شرک سے وہ بیزاری اور وحشت نہیں رہی جو ایک صحیح المزاج موحّد کو ہونی چاہیئے۔ ہر آدمی فطرتاً گندگی اور بدبو سے کراہت کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ غلاظت اٹھاتے ہیں یا غلیظ ماحول میں رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کی حس مُردہ ہوتی چلی جاتی ہے اور غلاظت سے تعلق سے انھیں تنفر باقی نہیں رہتا۔ یہی حال دیگر احساسات کا ہے۔ مروّجہ تصوف کے اکثر شیدائی اسی مصیبت کا شکار ہیں۔ انھیں دلیل سے قائل کرنا اور شرکیات کے تعفّن کا احساس دلانا اسی طرح دشوار ہے جس طرح غلاظت کمانے والے مہتر کو آپ یہ احساس نہیں دلا سکتے کہ اس کے ٹوکرے سے چھو کر آنے والی ہوا آپ کی قوتِ شامہ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

اُف یہ بے لگام مبلّغ

سوال ۳ :- از - محمد اسمٰعیل - بلگام -

مورخہ ۱۷ مئی بروز اتوار شب کے ۸/۳ - ۱۰ بجے شہر بلگام کی جامع مسجد میں مولانا ارشاد احمد صاحب فارغ دیوبند کا وعظ ہوا۔ موصوف نے فضائل اولیاء کرام پر بیان دیا۔ بیان کے آگے ایک دس سالہ لڑکے نے شاید حفیظ جالندھری کی ایک نظم پڑھی جو اس مضمون کے ہمراہ منسلک ہے۔ وعظ کے آگے مولانا ارشاد صاحب کو پتہ چلا کہ بلگام میں بہت سے لوگ جماعتِ اسلامی سے متعارف ہو رہے ہیں اور جماعت سے تعلق رکھنے والے رسائل کی فروخت ہو رہی ہے۔ مولانا صاحب نے ایجنٹ صاحب کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ لوگ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لٹریچر کو پڑھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں اور جماعت کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی لڑکیاں بے پردگی سے پھرتی ہیں اور مولانا مودودی کے نزدیک نماز کی مثال ایک فوجی پریڈ کے موافق ہے وہ لوگ امام اور مقتدی کی مثال ایک فوجی افسر اور سپاہیوں کی طرح سے دیتے ہیں۔ غرض جماعت اسلامی کی مخالفت میں آپ نے بہت کچھ کہا اور بالآخر ایجنٹ صاحب کو سمجھاتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ لوگ جماعت اسلامی کے طریقے سے گمراہ ہو کر قادیانی ہو جاتے ہیں اور جو لوگ دیوبندی عقائد رکھنے والوں کے ساتھ رہتا ہے وہ سچے اسلام کے طریقے پر رہتا ہے وہ گمراہ نہیں ہوتا غرض مولٰنا ارشاد احمد صاحب جماعت اسلامی کے خلاف احادیث و قرآن کی روشنی میں کچھ نہ ثابت کر سکے اور اس کے پیشتر مولانا ریاض احمد صاحب قاسمی بھی یہی بات ایجنٹ صاحب کو سمجھائے تھے۔

آمدم برسرِ مطلب! ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک دس سالہ لڑکے نے جب وعظ کے آگے شاید حفیظ جالندھری کی نظم پڑھی تو مولانا کے بیان میں پارہ بہت چڑھ گیا اور کہنے لگے کہ جماعت اسلامی سلاسل اولیاء کرام کو نہیں مانتی۔

جماعت اسلامی کے عقائد برابر نہیں۔ مولانا وحید الدین جو پندرہ سال تک جماعت اسلامی سے متعلق رسالہ "زندگی" کے اڈیٹر تھے جماعت سے اختلاف کی وجہ سے علیحدہ ہوگئے۔ آگے چل کر مولانا ارشاد احمد قاسمی نے فرمایا کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے شخص کی مثال اس شخص جیسی ہے جو بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے آکر کھڑا ہوگیا ہے۔

یہ تھا مولانا ارشاد احمد صاحب کے بیان کا وہ حصہ جو مولانا نے جماعت کے خلاف بلگام کی جامع مسجد میں فرمایا۔

میں جماعت اسلامی یا جمعیۃ العلماء یا اہل دیوبند کے نظریاتی اختلاف سے بحث کرنا نہیں چاہتا، آج کے حالات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آج جو مسلمانوں پر ظلم و ستم کے بادل منڈلا رہے ہیں اور برس چکے ہیں ان سے نپٹنے کے لئے جماعت اسلامی ہند نے مسلمانان ہند کی جانب سے اپنا فریضہ ادا کیا ہے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کر رہی ہے اور حکومت سے مسلمانوں کی حفاظت کا مطالبہ کر رہی ہے مظلومین کی امداد کر رہی ہے، مسلمانوں کو جو لٹ چکے ہیں فسادات کا نشانہ بنے ہوئے ہیں ان کو آباد کرانے میں اہم پارٹ انجام دے رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی سے لوگ متعارف ہوتے جا رہے ہیں جماعت اسلامی مسلمانان ہند میں مقبول ہو رہی ہے اور غیر مسلم بھی کچھ نہ کچھ اسلام سے متعارف ہو رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ جماعت اسلامی حکومت کے نزدیک معتوب ہے (خدا حکومت کو توفیق دے کہ حکومت جماعت کو سمجھ سکے) ایسی حالت میں مولانا ارشاد احمد صاحب کا جماعت پر کیچڑ اچھالنا کمی کی بات ہے مولانا ارشاد صاحب تفسیر پڑھے ہیں مگر آیہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ان کی سمجھ میں نہ آئی ہوگی۔ شیخ الاسلام سے درس حدیث لئے ہوں گے مگر اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا یہ حدیث شاید ان کی سمجھ میں نہ آئی ہوگی، ایک عالم دین کا اس طرح جماعت اسلامی پر کیچڑ اچھالنا اور عام مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا خدا کو پسند نہیں ہے اس طرح مولانا صاحب ہر قصبہ ہر شہر کے اندر جماعت اسلامی پر کیچڑ اچھالیں گے تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ لوگ اسلام سے بیزار و گمراہ ہو جائیں گے آج جبکہ جماعت اسلامی ہند کا لٹریچر ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں موجود ہے ملک کے جاہل مسلمان اسلام سے متعارف ہو رہے ہیں ان پر مولانا کے فتنے کا اثر پڑے گا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ مولانا کی تقریر کا جواب دیں۔

الجواب:—

مولانا ارشاد احمد صاحب فاضل دیوبند کو ہم زیادہ تو نہیں جانتے مگر جس حد تک جانتے ہیں اس کی روشنی میں ہمارا خیال تھا — اور ہے کہ وہ ایک اچھے آدمی ہیں شریف، سنجیدہ اور باوقار۔ ان کی طرف آپ نے جو ارشادات منسوب فرمائے ہیں ان کا اعتبار ہم کیسے کریں۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ کو غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مقرر کہتا کچھ ہے مگر روایت در روایت ہو کر وہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ کہیں یہاں بھی ایسا ہی نہ ہوا ہو۔ یادداشت پر زور ڈالئے۔ یہ سب کیا آپ نے خود موصوف کی زبان سے سنا تھا۔ کیا سچ مچ انھوں نے یہی کہا تھا جو آپ نے دہرایا؟

خدا کرے زور ڈالنے پر آپ کہہ اٹھیں کہ نہیں میں نے خود نہیں سنا بلکہ فلاں صاحب نے مجھے بتایا — بھلا فلاں صاحب کا کیا اعتبار — فلاں صاحب جھوٹے بھی ہو سکتے ہیں انھیں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر آپ کو اسی پر اصرار ہے کہ میں نے خود یہ سب سنا ہے تو ہم تاویل کریں گے کہ ہو سکتا ہے مبلغ موصوف کو کسی شریر نے غذا یا شربت میں ملا کر بھنگ یا شراب پلا دی ہو، اور اسی کے نشے میں وہ بے ارادہ طور پر ہذیان بکتے چلے گئے ہوں۔ یا پھر وہ کسی دماغی مرض کے شکار ہوں جس کا دورہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پڑتا ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا — یا سنا تو ضرور ہوگا کہ مرگی ایک مرض ہے جس کا دورہ دفعتًا پڑتا ہے اور آدمی کو درس عبرت بنا دیتا ہے۔ یہ زمانہ تو سائنس کا ہے۔ نئے نئے مرض چل گئے ہیں۔ دل اور دماغ کے امراض کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ تعجب اور نا ممکن نہیں ہے کہ محترم

ارشاد احمد صاحب بھی شعوری یا لاشعوری طور پر ایسے ہی کسی جدید دماغی مرض کے ہدف ہوں اور غیر محسوس طور پر اس کا حملہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہو۔

یہ دونوں ہی تاویلیں انھیں قابلِ رحم حد تک مرفوع القلم قرار دے سکتی ہیں۔ آخر سوچئے نا۔ ہم کیسے تیقین کرلیں کہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہوش و حواس کی سلامتی سمیت ایسی گھٹیا، مہمل اور ناپاک باتیں برسرِ عام زبان پر لا سکتا ہے جنھیں قصد و نیت کے ساتھ زبان پر لانے کیلئے بڑی مقدار میں بے حیائی، کمینے پن اور فرعونیت کی مقدار درکار ہو۔ گو کہ محترم ارشاد صاحب پیشہ ور مبلغ ہیں، دار العلوم دیوبند سے انھیں تنخواہ ملتی ہے اور پیشہ ور مبلغوں سے تقویٰ، اخلاقی بلندی اور ذمہ دارانہ روش کی توقع کوئی بھی ذی فہم نہیں کرسکتا۔ تاہم اتنی گراوٹ بھی بعید از قیاس ہے کہ صریح جھوٹ اور کھلی خرافات ان کے لبہائے مقدس پر جلوہ طراز ہو۔ نہیں۔ ہم نہیں مان سکتے کہ مولانا ارشاد احمد صاحب نے یہ یاوہ گوئی کی ہوگی۔۔۔ اگر بفرضِ محال کی ہے تو ہم نہیں مانتے کہ اس وقت وہ صحیح الدماغی کی حالت میں رہے ہوں۔ وہ قصوروار تو اس وقت ٹھیرتے جب ہوش و حواس کی سلامتی میں لغو گفتاری کا ارتکاب کیا ہوتا۔ ہوش و حواس ہی کسی شیطان نے بھنگ پلاکر مختل کردیئے یا کسی دماغی مرض نے دماغ کو برباد کردیا تو ایسے عالم میں آدمی کا کوئی فعل بھی جرم قرار نہیں پا سکتا۔

نشے یا مرض کی بات بعید از قیاس معلوم ہو تو ایک نکتہ اور قابلِ توجہ ہے۔ کبھی کبھار زیادہ کھانا اور مرغن کھانا بھی دماغ پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔ پیشہ ور مبلغوں کی خوش خوراکی محتاجِ بیان نہیں۔ کسی فلسفی ڈاکٹر سے پوچھئے وہ آپ کو بتائے گا کہ خوش خوراک لوگوں پر اکثر و بیشتر ایسے عالم گذرتے رہتے ہیں کہ وہ بجائے دماغ کے معدے سے سوچتے ہیں اور کھوپڑی ان کی فاسد و غلیظ ہواؤں کا اکھاڑا بن کر رہ جاتی ہے۔

جو کچھ بھی ہو۔ مولانا مودودی کی لڑکیوں کا تذکرہ مجمعِ عام میں زبان پر لانے والا ایک اعلیٰ درجے کے کمینے اور سفلے آدمی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا موصوف کے کوئی لڑکی ہے بھی یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کے بارے میں بے پردگی کا الزام گھڑنے والا ایسا ہی لچا اور شہدہ ہو سکتا ہے جیسا وہ آدمی جو یوں کہے کہ مبلغ ارشاد احمد صاحب کی لڑکیاں بازاروں میں ننگی پھرتی ہیں اور بال روموں میں ڈانس کرتی ہیں۔ استغفر اللہ۔ بھائی۔ بار بار طبیعت یہ ماننے سے ابا کرتی ہے کہ محترم مبلغ صاحب نے یہ یاوہ گوئی کی ہوگی۔ ارے پردے کے موضوع پر تو مولانا مودودی کی کتاب "پردہ" دنیا بھر میں بے مثال مانی گئی ہے اور ان کے خانوادے کی عفت و حیا کے دامن پر چھینٹے اُڑانے کی جرأت تو ان کے بدترین دشمنوں کو بھی نہیں ہوئی ہے۔ پھر کیسے تسلیم کرلیں کہ ارشاد احمد صاحب جیسے شریف آدمی کی زبان پر ایسی رذیل بات آئی ہوگی۔

ہاں دوسری باتوں کا ان کے دہنِ مبارک سے صدور ممکن ہو سکتا ہے۔ دوسری باتیں نئی نہیں ہیں بلکہ خاصی پرانی ہیں جو دار العلوم دیوبند کے بعض منتسبین بار بار دہراتے رہے ہیں۔ ان کا موصوف کی زبان پر آنا اس لئے بھی قرینِ قیاس ہے کہ ایک شریف ملازم کی حیثیت میں انھیں دار العلوم کا حق نمک ادا کرنا ہی چاہیئے اور اس لئے بھی قابلِ فہم ہے کہ دکانداری آج کل بغیر ایسی باتوں کے چل نہیں سکتی۔ آپ جانتے ہی ہیں عامۃ المسلمین اکثر و بیشتر جاہل اور ضعیف الاعتقاد ہیں انھیں گھیرے رکھنے کے لئے سب سے کم خرچ بالا نشیں حربہ طریقت و تصوف ہی کا ہے۔ یہ حربہ بریلی اور بدایوں کے حلقے میں عرس، قوالی، میلاد اور قبور کی جشنوں کا بھیس بدل لیتا ہے دیوبند کے حلقے میں یہ سلاسل اولیاء اور کراماتِ الاتقیاء کا چوغہ پہنتا ہے۔ جسم ایک ہے، لباس مختلف ہیں۔ آجکل کے کسی بھی دیوبندی مبلغ اور شیخ و واعظ کو کھرچ کر دیکھئے تو نیچے سے وہی کھال نکلے گا جو بریلویوں کی کھال کا ہے۔ فرق ضرور ہے مگر جوہری نہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ رنج اس کا ہے کہ نفاق بین المسلمین اور نفرت و کدورت کا پرچار اس وقت بھی بند نہیں کیا گیا

جب کہ ملک بھر کی امتِ مسلمہ طغیانِ تعصب کی زد پر ہے اور شرانگیں کاٹی جا رہی ہیں۔ مولوی ارشاد احمد صاحب ہوں یا کوئی اور صاحب آج کی نازک ترین ساعتوں میں بھی اگر وہ جماعتِ اسلامی کے خلاف جھوٹ، فریب اور افترا کا وہی سلسلہ جاری رکھتے ہیں جو اب تک جاری رہا ہے تو اس سے بڑا ملت فروش، بدنہاد، فتنہ پرور، بلید الذہن اور ہوش باختہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ جماعت اسلامی ہی اکیلی وہ جماعت ہے جو استقامت، حق پرستی، نظم و ضبط اور پرخلوص خدمت کی نمائندگی میں اس وقت اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس کے خلاف جتنے کچھ نظریاتی اعتراضات اٹھائے جاتے رہے ہیں ان کا بھی کافی شافی جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ مولانا حضرات کو اگر اب بھی اختلاف باقی ہے تو چلئے باقی رہے جائے، لیکن یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ مکر اور بازاری لے دے کا سلسلہ بھی جاری ہی رہے۔ کیسے ستم کی بات ہے کہ جس ابوالاعلیٰ کو قادیانیت کے خلاف کتابچہ لکھنے پر پھانسی تک کا حکم سنایا جا چکا ہو، جس سے بڑا اور قوی حریف قادیانیت کا کوئی نہ ہوا اسی کے بارے میں یہ سفید جھوٹ بولا جائے کہ اس کی کتابیں پڑھ کر لوگ قادیانی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں پھر لوٹ پھیر کر وہی بات دہرانی پڑتی ہے کہ جو پڑھے لکھے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ بھنگ، چرس یا شراب کسی نہ کسی نشہ سے ضرور ملوث ہیں یا پھر معدے کے وزن نے ان کے دماغ پر اتنا بوجھ ڈالا ہے کہ ان کے شعور اور لاشعور دونوں پچک گئے ہیں۔

آج کل کے حالات کا جہاں تک تعلق ہے اس پر آپ ہی نے کافی کہہ رکھا ہم کیا کہیں۔ آج تو موقعہ اس کا تھا کہ ہمارے مختلف گروہوں میں سچ مچ بھی جو نظریاتی اختلافات ہوں انھیں ہوا نہ دی جائے اور مل جل کر اس طوفان کے مقابلے کے موثر طریقے سوچے جائیں جو ہمیں مٹا ڈالنے کا عزم اور چیلنج لئے آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ آج بھی اگر مبلغ اور متکلم سیر واعظ تفرقہ اندوزی کی عادتِ دیرینہ کو ترک نہیں کرتے تو یہ دین و ملت کی ایسی ہی بدخواہی اور دشمنی ہے جس کی توقع سوائے منافقین کے کسی سے نہیں کی جا سکتی۔

نماز میں ترتیب قرأت

سوال :- از محمد علی امامی۔ گنٹہ مال۔

زید نے امامت کی۔ نمازِ فجر کے تعلق سے پہلی رکعت میں بعد سورۂ فاتحہ کے سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھیں اور دوسری رکعت میں بعد سورۂ فاتحہ کے سورۂ بقرہ کی درمیانی آیات پڑھیں کیا اس سہواً ترتیب کے بدلنے سے نماز ہوئی؟ یا ہمیں نماز دہرانی ہوگی؟

الجواب :-

نماز میں سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ یوں ہے کہ اگر فرض نمازوں میں قصداً ترتیب قرآنی کے خلاف کیا۔ مثلاً پہلی رکعت میں لِإِيلَافِ پڑھ لی اور دوسری میں الم تر کیف تو نماز میں کراہت تحریمی آجائے گی۔ نماز فاسد پھر بھی نہیں ہوگی۔

اور اگر ایسا قصداً نہیں کیا ہے بلکہ سہواً ہو گیا ہے تو کراہت بھی نہیں آئے گی نہ سجدۂ سہو لازم آئے گا۔ یہ معاملہ صرف فرض نمازوں کی حد تک ہے۔ فرض کے ماسوا سنن و نوافل میں قصداً بھی خلاف ترتیب پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

جو صورت آپ نے پیش فرمائی اس میں تو خود آپ ہی نے تصریح کر دی ہے کہ معاملہ سہو کا ہے ارادے کا نہیں لہٰذا نماز بلاکراہت ہو گئی۔ ارادۃً ایسا کیا گیا ہوتا تو نماز فاسد پھر بھی نہ ہوتی گو کہ اس میں کراہت آجاتی۔

ریڈیو کی حیثیت

سوال :- از محمد ابراہیم۔ حیدر آباد

عرض خدمت یہ ہے کہ ریڈیو جو آج کل عام ہے اور ہر گھر میں اس کا ہونا لازم سمجھا جاتا ہے اس کے تعلق سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا ریڈیو کا گھر میں رکھنا اور بجانا جائز ہے؟ مطلب میرا یہ ہے کہ ریڈیو کا استعمال بالعموم سیلون سے گانوں کی ریکارڈنگ سننے کے لئے ہوتا ہے اگر کبھی کبھار قرأت لگائی بھی گئی تو ہر کوئی

اپنے کام میں یا باتوں میں مشغول رہتا ہے اور قراءتِ قرآن کا احترام ہی نہیں ہوتا جب کہ حکم ہے کہ قرآن کا سُننا لازم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گانا بجانا سننا حرام ہے اور ریڈیو کا اس زمانے میں استعمال اسی مقصد کے لئے ہے اور ہر گھر سے گانے کی آواز اُٹھتی ہے۔ براہِ کرم جوابِ مفصّل آپ لفافے میں بیرنگ روانہ فرمائیں تو میں وصول کر لوں گا۔ یہ کرم فرمائی ہوگی اور ہم لوگ آپس کی بحث سے بچ جائیں گے۔ آج کل یہ موضوع ہمارے کنبے اور محلّے میں باعث بحث بنا ہوا ہے۔

الجوابُ :-

ریڈیو، ٹیلی ویژن، لاؤڈ اسپیکر وغیرہ یہ سارے آلات بجائے خود کسی قسم کی حرمت و کراہت نہیں رکھتے بلکہ ان کے حسن و قبح کا مدار ان کے استعمال اور مصرف پر ہے۔

آج کل ریڈیو کا جو مصرف ہے اسے بچہ بچہ جانتا ہے۔ گانا بجانا، ڈرامے، تفریحی فیچر اور خبروں کے نام سے پروپیگنڈے۔ یہ ہے کُل مصرف۔ ڈرامے جو ہوتے ہیں ان سے بھی اکثر و بیشتر مخصوص نظریات و عقائد کی تبلیغ و تشہیر کا کام لیا جاتا ہے اور یہ مخصوص نظریات و عقائد ظاہر ہے "حق پرستی" کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریڈیو کی کُل کائنات آج کل شر ہی شر ہے اور کبھی کبھار اتفاق سے اس کے ذریعہ کسی خیر کا حصول ہو ہی جائے تو اس کا کم و کیف شر کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

گہرائی میں نہ جائیے تب بھی یہ صورتِ واقعہ تو سب کے سامنے ہی ہے کہ ریڈیو کا سب سے بڑا مصرف گانا بجانا رہ گیا ہے کسی طرف نکل جائیے فلمی گانوں کے ریکارڈ گونجتے نظر آئیں گے فلمی گانوں کے علاوہ گیت سنگیت کی کلاسیکل اقسام بھی پروگرام کا خاصا اہم جزو ہیں ایسی صورت میں کسی بھی سلیم الطبع اور دیندار انسان کو اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت نہیں کہ ریڈیو کا گھر میں آجانا دین دنیا دونوں کے خسارے کا دروازہ کھل جانے کے مرادف ہے۔ دینی خسارہ تو ظاہر ہی ہے۔ دنیاوی خسارہ تضییع اوقات ہے اور اگر آپ بال بچوں والے ہیں تو ریڈیو ان بچوں کے اذہان و قلوب بگاڑتے ہیں وہ پارٹ ادا کرے گا جو کئی شیطان مل کر کر سکتے ہیں۔

دینی انحطاط اور فکری فساد کی حد یہ ہے کہ اچھے خاصے عالم قسم کے لوگ بھی ریڈیو پر قرآن کی تلاوت سُن کر جھومتے ہیں۔ انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ جھومنے کی نہیں شرم سے پانی پانی ہو جانے کی بات ہے۔ ایک چٹائی یا فرش پر صبح سے شام تک تاش، شطرنج اور گنجفہ کھیلا جاتا ہے کیا آپ گوارہ کیجئے گا اس پر کسی بھی وقت نماز بھی ادا ہو جایا کرے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ نجاست کی ایک قسم نجاستِ معنوی بھی ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مشرکین کو نجس کہا ہے۔ چٹائی پر تاش اور گنجفہ کوئی ظاہری غلاظت نہیں چھوڑتے مگر معنوی نجاست کا احساس ہر صاحبِ ایمان کر سکتا ہے اسی لئے وہ اسے بطور مصلّیٰ استعمال کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نوع بہ نوع شیطانی پروگرام گو کہ ریڈیو کے کل پرزوں میں آنکھوں سے نظر آنے والی غلاظت کا پلاستر نہیں چھوڑ جاتے لیکن ان پروگراموں کی معنوی نجاست ہر کل پرزے کے ایک ایک ایٹم میں رچ بس جاتی ہے پھر کتنے مسخ اور مردہ ہوں گے وہ قلوب جو معنوی نجاست کے اس دہانے سے اللہ کا کلام سنکر بجائے ذہنی گھٹن اور شدید کراہت کے فرحت اور تفریح محسوس کرتے ہیں۔

مصیبت تو یہ ہے کہ ریڈیو کو اچھے خاصے عالموں اور واعظوں تک نے اپنے گھروں میں داخل کر لیا ہے اور آڑ لی ہے "خبریں" سننے کی۔ ہو سکتا ہے بعض ان میں سے اپنی ذات کی حد تک خبروں ہی پر اکتفا کرتے ہوں لیکن جو شخص قانون کی نفسیات سے باخبر ہے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اسطرح کے امکانی استثناء ریڈیو جیسے مصدرِ شر کے جواز کی دلیل بن سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آج کا ریڈیو اپنے مصرف کے اعتبار سے حرام ہی کے زمرے کی چیز ہے۔ اگر کبھی براڈکاسٹنگ اسٹیشنوں پر دین داخلاق اور امانت و تقویٰ کے حاملین کا قبضہ ہو تب بیشک کہہ سکیں گے کہ یہ ایجاد دنیا کی بہترین ایجاد ہے اور اس کے ذریعہ اسی تیزی سے بھلائیوں کا فروغ ہو سکتا ہے جس تیزی سے آج برائیوں کا فروغ ہو رہا ہے۔

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

"اسلام کو سینے سے لگانے کے بعد تم پر کیا گذری؟"

ایک بار حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ بن الارت سے سوال کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مومنین اور مجاہدین اپنی شدید مظلومیت کی وادیٔ پُرخار سے گزر کے ساحل مراد پر آ پہنچے تھے۔ کفر و شرک توحید و رسالت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا ظلمت سمٹ چکی تھی اور نور پھیل چکا تھا ــــ لیکن اس سوال نے ایک بار پھر حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو ماضی میں واپس پہنچا دیا اور مکہ کا وہ تیرہ سالہ عہدِ خوں چکاں ان کی آنکھوں میں پھر گیا جس کو اہل ایمان و یقین کے سوا دنیا کا کوئی انسان ایک یا دو دن بھی شاید ہی برداشت کر سکے ــــ آنسوؤں اور خون میں لتھڑی ہوئی لمبی کہانی حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے پاک ہونٹوں تک اُبھر کر آ گئی اور ــــ تمام الفاظ گُنگ اور بے ہوش ہو گئے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کچھ بھی نہ کہہ سکے ــــ انھوں نے اس سوال کا جواب دینے کے لئے اپنا کرتہ ہٹایا اور اپنی کمر حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سامنے بے نقاب کر دی ــــ کمر کیا تھی چھالوں اور آبلوں کے نشانات کا ایک فرشِ گل تھا ــ زخموں کے داغ ہی داغ تھے۔ چوٹوں اور ضربوں کی بے شمار ریدھیاں تھیں۔ یہ مظلومیت کی ایک مرصع داستان تھی ــــ یہ جہاد و عزیمت کا ایک طویل افسانہ تھا ــ خدا کی قسم! یہ زندگی کا بہترین ساز و سامان تھا ــــ یہ تو آخرت کے ناپیدا کنار سفر کا بہترین توشہ تھا۔

"اللہ اکبر!" عقیدت اور درد کے مارے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بے ساختہ پکار اُٹھے "یہ تمھاری کمر ہے! ــ میں نے تو آج تک ایسی کوئی انسانی کمر کبھی نہیں دیکھی!..."

"جی ہاں!" حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے لبوں پر ادائے شکر کا وہ تبسم کھل اُٹھا جو صرف ایک مومن کے چہرے پر نظر آ سکتا ہے۔ "خدا جانے کتنی ہی بار مجھے ایمان کو بچانے کے لئے جان کی بازی لگانی پڑی ــ شعلوں کے بستر پر میری راتیں کٹی ہیں اور تپتی ہوئی زرہ پہنا کر مجھے ریگستان کے تنور میں گھسیٹا گیا ہے اور یہ آگ سچ مچ میرے لہو اور میری چربی سے بجھتی تھی ــ زندگی کے ہر سانس کو درد و کرب کا جہنم بنا کر مجھ سے کہا جاتا تھا کہ میں اپنے خدا کو چھوڑ دوں ــ لیکن حقیقی دوزخ کی لپیٹ سے بچنے کے لئے میں نے دنیا کے ہر الاؤ کو ہنسی خوشی برداشت کیا ــــ یہ خدا کا فضل و کرم تھا وہ جس پر چاہتا ہے اس کی بارش فرماتا ہے"

"پھر کیا ہوا؟" حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھیں رشک اور عقیدت سے چھلک رہی تھیں۔

"پھر مظلومیت کی خوں چکاں گھاٹی آخر آخر طے ہو گئی اور ظلم و ستم سے انتقام لینے کے لئے آٹھ کھڑے ہونے کا دوسرا معرکہ آ پہنچا ــ ہائے جہادِ زندگی کے وہ معرکے تھے! ــــ جب تلواروں کی چھاؤں میں میٹھی نیند سونے کے لئے ہم اپنے گھروں سے یہ دعائیں مانگتے ہوئے نکلتے تھے کہ اے کاش میدانِ جہاد سے ہماری واپسی ہمارے

خدا کی طرف ہو! ـــ جب خدا سے ملاقات کرنے کی بیقرار آرزو میں ہم زندگی کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر زمین و آسمان سے دُور ـــ بہت دور نکل جانا چاہتے تھے ... جب ..."

یکایک حضرت خبابؓ پر گریہ طاری ہوگیا ـــ آواز سینے میں بیٹھ رہی تھی اور آنسوؤں کی بوندیں پلکوں سے ٹپک کر ان کی داڑھی تر کر رہی تھیں۔

"اے خبابؓ بن الارت! ـــ رونے کی کیا بات ہے؟"

لوگوں نے تڑپ کر سوال کیا:۔

حضرت خبابؓ نے آنسوؤں کے درمیان سے جواب دیتے ہوئے فرمایا ـــ "میں اس لئے روتا ہوں کہ ان تمام معرکوں کے بعد ہم پر خدا نے دنیا کے خزانوں کا منھ کھول دیا ـــ ہمارے سروں پر عزت و حشمت کے پرچم لہرائے .... تو میرے بھائی! میں ڈرتا ہوں ... کہ ... کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ہمارے حقیر کاموں کا حساب اسی دنیا میں چکا دیا گیا ہو۔ ... اور آخرت کے بازار میں ہم خالی ہاتھ کھڑے نہ رہ جائیں۔"

یہ وہ شخص دنیا کی خوشحالی کو دیکھ کر آخرت کے خسران کے تصور سے رو رہا تھا جس نے زندگی کی صرف ستتیس بہاریں دیکھی تھیں یہ وہ جوان تھا جس کے نفس کی ہر مادی اُمنگ کو دارالبقا کے خطروں نے بوڑھا کر دیا تھا۔ جس نے یہ تہہ کی بات پالی تھی کہ یہ دنیا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو مگر بہرحال سرائے فانی ہے ـــ محض حسن رہگذر ہے جو منزل تک پہنچانے کے بجائے مسافر کو اس کی منزل سے غافل کر دینا چاہتا ہے ـــ دنیا سے بھاگ کھڑے ہونا بدترین بزدلی تھی اس لئے وہ اسکے درمیان سے گذر رہا مگر دنیا میں پاؤں پھیلا کر سوجانا بدترین موت تھی اس لئے وہ ادھر اُدھر دیکھنے کے بجائے اس دنیا پر نظر جمائے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہا تھا جو آنکھ بند ہوتے ہی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ دنیا میں رہ کر اس نے دنیا کو اس حد تک چھوڑ دیا تھا کہ بستر موت سے اسے وصیت کرتے ہوئے سنا گیا۔

"مجھے آبادیوں میں مت دفنا دینا! ـــ کوفہ کے ویرانوں میں میری پہلی قبر بنائی جائے ... دیکھو جنگل میری طرف بازو پھیلائے ہوئے ہیں۔"

ان کے انتقال کے بعد ایک بار حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی قبر پر سے گذرے تو بے اختیار رقت طاری ہوگئی "اللہ خبابؓ پر رحمت کی بارش کرے" انھوں نے کہا "جو خوشی سے مسلمان ہوا ـــ پھر خوشی سے ہجرت کی، جہاد میں اپنی عمر کاٹی اور مصائب پر مصائب برداشت کئے ـــ مبارک ہے وہ شخص جو زلزلۂ محشر کو یاد رکھے ـــ میزان عمل کے پاس کھڑے ہو کر زندگی کا وزن کرانے کی تیاری کرے ـــ گذران کے بقدر مال پر قناعت کرے اور اپنے مولائے حقیقی کو راضی کر لیجائے ..."

جس وقت آلِ یاسرؓ پر ظلم و ستم کی قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی ـ جب حضرت یاسرؓ کا بڑھاپا آتشیں زنجیروں میں جکڑ ڈالا گیا تھا جب ان کی بوڑھی شریک زندگی حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ٹھوکروں اور کچوکوں، شعلوں اور زنجیروں کے درمیان سے گذرتی ہوئیں جان دینے والے پر جان دینے کی ریت ڈالنے کے لئے اسلام کی پہلی شہادت کا افتتاح کرنے جا رہی تھیں ـــ جب ان بوڑھے ماں باپ کا جوان سال عمارؓ ظلم و استبداد کے آخری شکنجوں میں کسا جا رہا تھا ـــ اُس وقت وہ عاشقانِ پاک طینت اہو کے فواروں اور آنسوؤں کی موسلا دھار برسات میں یکایک فرطِ مسرت سے مسکرا اٹھے ـــ صرف اس لئے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ان سوختہ سامانوں کے پاس سے یہ کہتے ہوئے گذر گئے تھے:۔

"صبر کرو اے آلِ یاسر! وعدہ ہے کہ تم سے ملاقات جنت میں ہوگی ..."

سمیہؓ کی روح پر وجد طاری ہو چکا تھا ـ قدرت کرب سے جب زبان اینٹھ گئی تھی وہ ظالموں سے کہہ رہی تھیں کہ "خدا ایک ہے ـــ خدا کی قسم!" بوڑھے ماں باپ نے اسلام پر جانیں نثار کر دیں اور جوان سال عمارؓ اسلئے زندہ رہے تاکہ ہجرت و جہاد کے جو حصے نکلتے ہیں ان کے بعد شہید ہوں۔ انھوں نے مکہ میں اپنا گھر چھوڑا اور ہجرت مدینہ کی راہ پر

چل کھڑے ہوئے —— مدینے کے قریب دامن قبا میں انھوں نے پُرشوق مزدور کی طرح اللہ کا گھر تعمیر کیا —— مسجد قبا کے لئے سب سے پہلا پتھر جس شخص نے اُٹھایا وہ خاندان یاسرؓ کا ہی چشم و چراغ ہی تو تھا۔ پھر شمشیر و سناں کی زد میں کھڑے ہو کر انھوں نے شہادت کی چاپ سُنی تو روح رقص کرنے لگی اور ہونٹوں پر یہ نعرۂ مستانہ گونج اٹھا۔

"اب جا کر دوستوں سے ملیں گے ہم! —— محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملیں گے —— ان کی جماعت سے ملاقات ہوگی"

یہ نعرۂ شوق بلند کرتے ہوئے ہونٹ خشک ہونے لگے اور کسی سے پانی مانگا تو دودھ سامنے کیا گیا، اس کو پیا اور پی کر فرمایا:۔

"حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تو دنیا کی سب سے آخری چیز دودھ پیے گا۔۔۔"

یہ کہہ کر خوشی سے بے قابو ہو گئے —— اور شہادت نے بڑھ کر ان کو سینے سے لگا لیا —— وہ جس دنیائے فانی میں چورانوے سال تک مقیم رہے تھے۔ اس دنیا سے بچھڑنے کا انھیں کچھ غم نہ تھا —— وہ خوش تھے کہ جس خدا کے وہ ہیں اسی کی طرف پلٹ کر جا رہے ہیں اور کامیاب و سرخرو جا رہے ہیں۔

حضرت صہیب رومیؓ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور دنیا ان کو پکارتی ہوئی پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

"ہم تمھیں مدینے نہ جانے دیں گے —— ہرگز نہ جانے دیں گے" مکّہ کے کفار تعاقب کرتے ہوئے چیخ رہے تھے "ہمارے نیزے تمھارے خون کے پیاسے ہیں —— ہماری تلواریں تمھارے وجود سے کھیلنا چاہتی ہیں —— ہم تمھیں اے اللہ والو! یوں آسانی سے نہیں جانے دیں گے"

حضرت صہیبؓ نے مردانہ وار پلٹ کر تعاقب کرنے والوں کی طرف دیکھا:۔

"دنیا کی سب چیزیں میں تمھارے پاس چھوڑ آیا ہوں اور صرف ایمان بچا کر ساتھ لئے جا رہا ہوں —— میری دولت میرا مال، میرا گھر بار، میری خوبصورت باندیاں —— وہ سب کچھ تم لے لو —— اور مجھے جانے دو —— اور اگر اس پر بھی تم آڑے آتے ہو تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا مگر خدا کی طرف پیٹھ پھیر کر مکے کی طرف ہرگز رُخ نہ کروں گا —— آؤ! تم میری لاش لے جا سکتے ہو —— مگر یہ لاش بھی اس وقت جا سکے گی جب میرے ترکش کا آخری تیر ختم ہو چکا ہوگا۔۔"

یہ کہا اور مکّہ کے اس مشہور تیر انداز نے اپنی کمان دوہری کر لی —— دنیائے دنی کے پرستاروں نے جب دیکھا کہ وہ اپنی ساری دنیا پیچھے چھوڑ کر جا رہا تھا تو فاتحانہ خوشی کے ساتھ اس خدا کے دیوانے کو چھوڑ کر گھر چلے آئے مگر یہ حق کا پروانہ جب مدینے کے قریب پہنچا تو قرآن کی یہ آیتیں اس کے استقبال کے لئے عرش کی بلندیوں سے فرش زمین پر اُتر رہی تھیں کہ:۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ"

"اور ایسے بھی لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کے لئے اپنی جان کو خرید لیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے"

جس وقت وہ مدینے کے قریب پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں ہی تشریف فرما تھے۔

"تم نے اے صہیب نفع کی تجارت کی!" صہیبؓ کی صورت دیکھتے ہی اللہ کے رسولؐ نے مبارکباد پیش فرمائی۔

یہ سننا تھا کہ حضرت صہیبؓ کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا —— اس وقت ان کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ مکّہ میں دولت دنیا سے دامن جھاڑ کر چلے آئے ہیں۔ حضورؐ کے سامنے کھجوریں رکھی تھیں اور حضرت صہیبؓ اس تبرک پر جھپٹ گئے۔ وہ اتنے خوش نظر آتے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"تمھاری آنکھیں دُکھ رہی ہیں اور کھجوریں کھاتے ہو!" حضورؐ نے شفقت بھری تنبیہ کی۔

"حضور!" حضرت صہیبؓ نے پُرمزاح جواب دیا:۔
"اس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو دُکھ نہیں رہی!"
اور اس جواب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے
— پوری محفل پر مسرت کی فضا چھا گئی — کون کہہ سکتا تھا کہ
یہ آنے والا ابھی ابھی اپنی ساری دُنیا لُٹا کر آیا تھا!۔

کیسی تھی وہ محفل جہاں ایمان کی شمع روشن تھی! جہاں
وہ لوگ رونق افروز تھے جو خدا کے خریدار تھے اور خدا ان کا
خریدار تھا! جو متاعِ دنیا کو پاتے تھے تو آخرت کے افلاس
کا کھٹکے سے اُن کا اندیشہ صبر و ضبط کا پیمانہ چھلکا دیتا تھا مگر
جو دنیا کو لُٹا کر اس طرح خوش ہوتے تھے جیسے کوئی بہت
بڑا بوجھ سر سے اُتر گیا ہو!—
لیکن — آج ایک عرصہ سے ہمارے سینوں میں کیسی
تاریکی ہے — کیسی بے کنار تاریکی اور ویرانی — کیا خدا
نخواستہ اندر ہی اندر ہمارے ایمان کی شمع گُل ہو چکی ہے؟—
— خدارا کوئی بتاؤ — کیا ہم مسلمان ہیں؟ — آہ! — کیا
ہم مسلمان ہیں؟ — قبریں ہماری طرف منہ کھولے بڑھ رہی
ہیں مگر ہم بیٹھے مڑ مڑ کر للچائی ہوئی نظروں سے اسی دنیائے فانی
کو تک رہے ہیں جس کے ذرّے ذرّے میں ہمارا دل اٹکا ہوا ہے
— زمین ہمارے پاؤں تلے سے کھسک رہی ہے مگر گرتے گرتے
ہم چاہتے ہیں کہ خدا کے آستانے کے بجائے ہمارا سر دنیائے دنی
کے قدموں پہ جا گرے! اُف! میرے خدا! — یہ ہم کیا کر رہے
ہیں؟ —
ہم کہاں ہیں — یہ کیسا اندھیرا ہے جو ہماری روح کو
ڈس رہا ہے اور یہ کیسی ویرانیاں ہیں جو ہمارے دلوں کی وسعتوں
میں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہیں —

کیا ہم مسلمان ہیں؟ } شمس نوید کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شہ پاروں کا مجموعہ سوز و گداز، للہیت، اخلاص، درد اور دل کشی کا گنجینہ۔ مجلد سوا دو روپے۔

اعلیٰ درجے کے عطریات

روحِ چمن
نہایت دلنواز اور پُرکیف خوشبو
دل و دماغ کو سرور و تسکین کا
احساس دینے والی۔ کافی تیز
اور دیرپا۔ ایک تولہ کا پیکنگ دس روپے
چھ ماشے کا پیکنگ ساڑھے پانچ روپے
تین ماشہ " تین روپے
ڈیڑھ ماشہ " ڈیڑھ روپے

عطرِ گلزار
اس کی خوشبو "روحِ چمن" سے کچھ ہلکی
ہے۔ بعض طبائع ہلکی اور بھینی خوشبو پسند
کرتی ہیں۔ ان کیلئے خاص تحفہ۔
ایک تولہ.......... ۸ روپے
چھ ماشے.......... ساڑھے چار روپے
تین ماشے.......... ڈھائی روپے
ڈیڑھ ماشے.......... سوا روپیہ

کوئی سی بھی ایک یا دو تین شیشیاں طلب فرمائیں گے تو
محصولڈاک ہر صورت میں ڈیڑھ روپیہ صرف ہوگا۔ اگر
سرمہ در نجف بھی ساتھ ہی منگائیں تب بھی محصولڈاک یہی رہیگا

دارالفیض رحمانی دیوبند یو۔پی

فتاویٰ عالمگیری (اردو)

توضیحی حاشیوں کے ساتھ

پہلا اور دوسرا جز ممبروں کو جا چکا ہے ــــ تفصیلات آپ پچھلے اعلانات میں پڑھ چکے ہیں۔ پھر سمجھ لیجئے کہ فیس ممبری صرف ایک روپیہ ہے

ایک روپیہ دینے کے بعد آپ سارے ہی اجزاء ڈاک خرچ کے بغیر حاصل کر سکیں گے جبکہ فقط ایک ہی جزء پر تقریباً ایک روپیہ ڈاک خرچ آتا ہے۔ ہر جزء جو ہر دوسرے مہینے چھاپا جا رہا ہے سوا دو روپے کا ہوگا۔ ممبروں کو اتنے ہی پیسوں میں وی پی سے روانہ کیا جائے گا۔ حالانکہ اگر ڈاک خرچ ملا کر وی پی کیا جائے تو سوا تین روپے بنتے ہیں۔ صرف ایک روپیہ ممبری فیس ادا کر کے آپ تمام اجزاء کے ڈاک خرچ سے بچ جاتے ہیں۔ آج ہی ممبر بنئے اور جزء اول طلب فرما لیجئے۔

یہ بتانا شاید غیر ضروری ہوگا کہ فتاویٰ عالمگیری کا علمی فقہی مقام کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب ہر طرح کے مسائل کا گنجینہ اور علماء کے نزدیک معتمد علیہ ہے۔ سلیس ترجمے کے علاوہ تشریحی نوٹوں نے اس کی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب معیاری۔

عین الہدایہ ــــ اردو شرح ہدایہ

حنفی فقہ کی مقبول و مستند کتاب ھدایہ کی اردو شرح دو ماہی قسطوں میں چھاپی جا رہی ہے۔ اب تک چھ ۶ قسطیں چھپ چکی ہیں۔ چھٹی زیر تکمیل ہے۔ ہر قسط کی قیمت دو ۲ روپے۔ ڈاک خرچ ۸۰ پیسے

لیکن جو لوگ ایک روپیہ فیس ممبری بھیجکر ممبر بن جائیں گے انھیں ڈاک خرچ معاف ہوگا اور وی پی صرف دو ۲ روپے کا جائے گا۔ نئے ممبران پچھلی پانچ قسطیں بھی طلب فرما سکتے ہیں محصول ڈاک نہیں لیا جائیگا۔

اس پتے پر آرڈر دیجئے

مکتبہ تجلی ــــ دیوبند ــــ یو۔پی

پاکستان کا پتہ

مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ ــــ مینا بازار ــــ پیر کالونی ــــ کراچی

پاکستانی حضرات:۔ فیس ممبری اور قیمت اجزاء اس پتے پر بھیجکر دیوبند اطلاع دیں۔ مطلوبہ اجزاء ڈاک سے پہنچ جائینگے

مؤتمر قاہرہ

جون ۶۳ء کے تجلی میں آپ ایک سوال وجواب "مصر کی علماء کانفرنس" کے عنوان سے پڑھ چکے ہیں۔
آیئے اس کانفرنس سے متعلق کچھ تاثرات اوروں کے بھی ملاحظہ فرمایئے۔
علامہ سید محمد یوسف بنوری اس کانفرنس کے لئے پاکستانی وفد کے رئیس تھے۔ آپ علامہ انور شاہ صاحب کے شاگرد رشید ہیں اور ان متبحر عالموں میں ہیں جن کی بساط زمانہ اب اُلٹتا جارہا ہے۔ ٹھوس مطالعہ، گہری نظر۔ قرآن وسنت کے دقائق پر عبور۔ فرمودات سلف سے کما حقہ واقفیت اور سب سے بڑی بات یہ کہ فکر ونظر کے زاویے مومنانہ بصیرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ ایسے لوگ اب خال ہی خال رہ گئے ہیں اور ڈر ہے کہ آگے کو خال خال بھی شاید ہی نظر آئیں۔ بہرحال آپ ماہنامہ بیّنات (کراچی) میں رقم طراز ہیں:۔

علمائے ازہر کے بارے میں رائے

ہندوستان و پاکستان کے اکابر علماء میں جو خصوصیت ہے وہ خصوصیت محسوس ہوا کہ عربی ممالک کے اہل علم سے مدت ہوئی کہ رخصت ہوچکی ہے۔ دینی تصلب و پختگی شعائرِ اسلام کی بقاء کی کوشش، بلاخوفِ لومۃ لائم کے اظہار میں جرأت اور قوتِ ایمانی کا ثبوت، کسی غیر علیم مقصد کیلئے حکومتِ وقت کا آلہ کار نہ بننا اور اس مسلک میں جو عواقب و نتائج پیش آئیں خندہ پیشانی سے لبیک کہنا میں سمجھتا ہوں کہ یہ جوہر ممالک عربی میں ختم ہوچکا ہے۔ تاریخی روشنی میں مجھے نظر آتا ہے کہ چند افراد کو مستثنیٰ کرنے کے بعد سوائے گیارھویں صدی ہجری سے وہ صفات جو عرب ممالک کے خصائص تھے غیر منقسم ہندوستان کی طرف منتقل ہوگئے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز دہلوی حضرت سید احمد بریلوی، حضرت اسمٰعیل شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ جمیعاً کی نظیر اپنے اپنے دور میں مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔

جو حضرات ازہر کے نمائندہ علماء تھے اور جو سوڈان، لبنان، عمان، قدس، غزوہ، تونس وغیرہ سے آئے تھے۔ اِن حضرات میں وہ بات محسوس نہ ہوسکی جس کی ان سے توقع تھی۔ البتہ موریتانیا اور مراکش و فاس کے علماء کو زیادہ پختہ پایا۔ یہ حضرات جدید رو میں بہنے کیلئے تیار نہ تھے۔ میرا احساس یہ ہے کہ حکومتِ مصر کے پیشِ نظر جو کام ہیں علماء ازہر چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ان مقاصد کا فقہ اسلامی کی روشنی میں حل نکالنا ضروری ہے اور اس کی دو وجوہ نظر آتی ہیں (۱) ان کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ اگر ان مسائل کو اس طرح حل نہ کیا گیا اور حکومت کے منشاء کی تکمیل نہ ہوسکی تو اس کے خطرناک عواقب برداشت نہ کرسکیں گے (۲) یا یہ خیال ہے کہ عصرِ حاضر میں اتنا جمود بے معنی ہے

اور توسّع و آزادی ضروری ہے۔ اگر اساسی اصول قرآن و سنت کو مان لئے جائیں تو پھر رخصت و تیسیر پر عمل کرنا یا کسی ضعیف قول کو اختیار کرنا عین مصلحت و ثواب ہے بلکہ اس وقت یہی صواب ہے۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو ایک قسم کی مداہنت عام علماء میں زیادہ محسوس ہوئی کلمۃ حقٍ عندَ سُلطانٍ جائرٍ (ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق) کی جرأت ان میں نہیں ہے بہت ممکن ہے کہ جو استبدادی پنجہ ان کے سامنے ہے اس کے خوف سے یہ صورت پیدا ہو چکی ہو اس لئے مؤتمر کے ان مقالات میں جو مستقل اعضاء و ارکان نے تحریر کئے تھے ان میں یہ بھی ضعف نمایاں تھا' ایسا محسوس رہا تھا کہ اس میں کوئی مقصد پنہاں ہے جس کی تکمیل کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ بھی نہایت عالمانہ بلکہ محققانہ انداز سے جس کی گرفت بھی آسان نہ ہو البتہ چونکہ سب مقالات پختہ اہلِ علم کے قلم سے تھے اس لئے ایسے نہ تھے جیسے ہندوستانی قسم کے سوقیانہ یا ادارۂ ثقافت کے دین فروشانہ یا اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے عام مقالات ہوتے ہیں جنہیں ضروریاتِ دین یعنی دین کے قطعی حقائق کو مجروح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ مؤتمر کے علماء کے مقالات میں ہمارے ملک کے مسلّمہ اکابر کی تحقیقات کی جو نوعیت ہوتی تھی وہ روح جلوہ گر نظر نہیں آتی۔

جدید ازہر کے خدوخال

مؤتمر کے دوران میں مندوبین کے سامنے جو علمی و دینی کارنامے سامنے آئے ان میں سب سے زیادہ اہم الازہر یونیورسٹی کا تجدیدی نظام یا الازہر کی نشاۃِ ثانیہ ہے جس کی عظیم الشان عمارات کی بنیاد قاہرہ و مصر کے جدید شہر "مدینۃ النصر" میں رکھی گئی ہے۔ مدینۃ النصر کے جس علاقہ میں اس جدید یونیورسٹی کے لئے کئی مربع میل کا احاطہ تھا اس میں جس جگہ بنیاد رکھی جانے والی تھی ایک عظیم الشان حسین و جمیل پنڈال بنایا گیا تھا جس میں اسکندریہ سے قاہرہ تک الازہر کی مختلف شاخوں سے آکر بیٹھنے والے طلبہ و علماء ہی بیس ہزار تھے۔ اسٹیج پر صرف مندوبین اور المؤتمر کے وفود اور جمال عبد الناصر اور ان کے نائبین کے لئے کرسیاں تھیں جن پر نام لکھے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا خوبصورت اور عظیم الشان پنڈال نہایت خوبصورت قیمتی قالینوں سے فرش شدہ کبھی نہیں دیکھا تھا' یہ جس خوبصورتی سے سجایا گیا تھا قابلِ دید تھا۔ اتفاق سے جمال عبد الناصر اس روز ملک حسین والیٔ اردن کے ودامی امور میں مشغول تھے اس لئے نہ آسکے اور حسین محمود شافعی نے ان کی نیابت کی۔ خلیل مصری کی قرأت سے افتتاح کی کارروائی شروع ہوئی۔ پھر تقریریں ہوئیں اور اس کے بعد سنگِ بنیاد رکھا گیا جس میں وفود کی طرف سے شیخ ابراہیم نیاس نے وکالت کی۔ اس موقع پر ایک بڑا تمغہ سب مندوبین کو دیا گیا جس پر کوفی خط میں "تذکار وضع حجر الاساس الازھر الجدید" کی عبارت کندہ تھی۔ یہ تمغہ ایک مخملی ڈبے میں رکھا ہوا تھا۔

اس مؤتمر کے مصارف کے لئے ابتدائی طور پر حکومت نے دس ملین پونڈ یعنی دس کروڑ روپے کی منظوری دیدی تھی۔ جدید یونیورسٹی میں جو جو کالج اور شعبے قاہرہ و اسکندریہ یونیورسٹی میں ہیں وہ سب کے سب مزید ترقی یافتہ صورت میں موجود ہوں گے اور یورپ کی چند زبانوں میں سے فرانسیسی' انگریزی' جرمنی' ایطالوی کوئی نہ کوئی زبان سیکھنا ازہری عالم کے لئے ضروری ہوگا جہاں تک علوم دینیہ کی مہارت کے ساتھ یورپ کی کسی زبان سیکھنے کا تعلق ہے۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے آج کل تبلیغ و تالیف و تحقیق کے لئے ان زبانوں میں سے کسی ایک کا حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اگر متقی علماءِ دین اس طرف توجہ کریں تو اسلام کی تبلیغ و تحقیق کا نقشہ ہی بدل جائے' لیکن جہاں تک علوم دینیہ میں مہارت کا تعلق ہے یعنی تفسیر و حدیث' فقہ و

اصول فقہ، فلسفہ، کلام میں اعلیٰ ترین قابلیت کا تعلق ہے اس جدید نظام میں یہ پہلو بہت کمزور ہے۔ الازہر کی جو خصوصیت چلی آرہی تھی کہ علوم اسلامیہ دینیہ کے ماہرین پیدا کئے جائیں وہ خصوصیت اب ختم ہو جائے گی۔ یوں تو تقریباً ایک سو سال سے یہ ضعف دن بدن بڑھتا ہی جارہا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب اس امتیاز کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔ آخر ان جدید علوم کے لئے کیا ضرورت تھی کہ الازہر بھی اس خدمت کو انجام دیتا۔ مصر میں یونیورسٹیاں اور وزارت معارف و تعلیمات کے ادارے اس خدمت کو انجام دے رہے تھے۔ قرآن و سنت کے محققین و ماہرین پیدا کرنے کی جو ضرورت ہے وہ اس صورت سے پوری نہ ہو سکے گی بلکہ اگر یہ ہوتا کہ علوم دینیہ میں تو انتہائی مہارت پیش نظر رہتی اور علوم جدیدہ میں کسی قدر واقفیت اور یورپ کی کوئی زبان ضروری قرار دی جاتی تو بہتر ہوتا لیکن جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ علوم دینیہ سے تو بقدر ضرورت واقفیت رہے اور جدید علوم میں مہارت خصوصی حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال امید افزا نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے الازہر کو جو تاریخی خصوصیت حاصل تھی وہ بالآخر ختم ہو جائے گی۔ میرے خیال میں اگر کوئی قوی العزم با وقار محقق عالم اور دینی مفکر حسن تدبیر کے ساتھ صحیح طریقہ پر جمال عبدالناصر کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو شاید یہ سعی مثمر ہوتی لیکن محسوس ہوا کہ اس وقت تو کوئی شیخ الازہر ہی نہیں۔ شیخ محمود شلتوت مرحوم کے بعد اب تک اس جلیل القدر عہدے کے لئے کسی کا انتخاب نہیں ہوا ہے۔ سنا ہے کہ الشیخ عبدالرحمٰن تاج اس جلیل القدر منصب کے لئے موزوں شخصیت ہیں۔ افسوس ہے کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور ان اجتماعات و احتفالات میں ان کا یکسر شرکت نہ کرنا یا تو ان کے معتوب ہونے کی وجہ سے تھا یا پھر ان کے اس تجدید سے غیر مطمئن ہونے کی دلیل ہے۔ بہر حال علماء ازہر جو حکومت کے نظام سے وابستہ ہیں اگر تدبر و حکمت کے ساتھ قدم اٹھائیں تو شاید بہت کچھ اصلاح ہو سکے گی۔

جمال عبدالناصر

جمال عبدالناصر اور اس کے کارنامے یا عملنامے یہ میرا موضوع سخن نہیں اس لئے اس روئداد میں اس کا تذکرہ بے محل ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض حضرات گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور موتمر کا جس انداز سے جائزہ لیا گیا ہے اس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں اس لئے چند سطریں وضاحتاً پیش خدمت ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جمال عبدالناصر ایک فوق العادۃ شخصیت کے مالک ہیں، عزم و ارادے کا اتنا مضبوط آہنی انسان ہے کہ شاید ہی مسلمانوں میں ازمنۂ متأخرہ میں اس قوت و ارادے کی کوئی شخصیت اس درجہ کی گذری ہو۔ جمال ناصر استعماریت اور یورپ خصوصاً برطانیہ کے شدید ترین مخالف ہیں۔ ان کی شاید ہی کوئی تقریر استعماریت پر حملے سے خالی ہوتی ہو، وہ ان تھک کام کرنے کے عادی ہیں۔ بہترین خطیب ہیں۔ عیاشی سے ان کی زندگی خالی ہے۔ اخلاقی کمزوریوں پر ان کے دشمن بھی ان کو متہم نہیں کر سکتے۔ وہ روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنے کے عادی ہیں ان کا دماغ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اسکیم سوچتا ہی رہتا ہے۔ ناصر کی زندگی سادہ ہے۔ صدر مملکت ہونے سے پہلے جب کرنل تھے تو جس مکان میں رہتے تھے اب بھی اسی میں رہتے ہیں، ان کی اہلیہ گاؤں میں رہتی ہیں اور مہینے میں دو بار خود ناصر اپنے گاؤں جاتے ہیں، ان کے بچے سائیکل پر اسکول جاتے ہیں۔ جتنا پروپیگنڈہ ان کے خلاف ہوتا رہا ہے مصر کی موجودہ ملکی ترقیات نے سب کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ وہ نہ خروشیف کے حلیف ہیں، نہ امریکہ و برطانیہ کے، البتہ اپنے ملک میں اشتراکیت کو لاکر اشتمالیت سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور موجود کمیونزم کا جواب سوشلزم سے دینا چاہتے ہیں۔ اس سوشلزم کے اختیار کرنے کی وجہ سے روس کا قدرے اعتماد حاصل ہو چکا ہے۔ روس

کو دراصل یہ طمع ہو گئی ہے کہ شاید آئندہ کسی وقت یہ ملک کمیونسٹ بن جائے لیکن ناصر ایک سخت دل انسان ہے اپنے مخالف کو ختم کرنے میں کوئی رحم نہیں کرتا — جب انتقام پر اُتر آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی نہیں۔ جمال ناصر اپنی رائے میں بہت مستبد ہیں، بہت کم کسی کے مشورے پر عمل کرتے ہیں گو اُن کی رائے ہمیشہ صحیح بھی نہیں ہوتی۔ اُن کی تربیت دینی نہیں ہوئی ہے نہ مزاج ہی دینی پایا ہے اس لئے جس طرح دنیوی مسائل کے سمجھنے کی ان میں اہلیت ہے دین کو سمجھنے کی نہیں ہے۔ اسی لئے جس انداز سے دنیا کی طاقت و شوکت کے طریقوں کو سوچ کر وہ آگے بڑھ رہے ہیں دین کی حیثیت وہاں صفر نظر آتی ہے۔ کاش ناصر کا مزاج دینی ہوتا تو آج مصر کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ وہ اپنی رائے میں بسا اوقات اتنی جلد بازی کر جاتے ہیں کہ نقصان تک اُٹھانا پڑتا ہے۔ وہ ابتداءً عرب ممالک کے اتحاد میں کوشاں تھے اور عرب سیادت کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن اس مقصد میں ناکام ہو کر اب افریقہ کے جدید آزاد شدہ ممالک میں رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسلامی ممالک سے تعلقات درست کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک کڑی مجمع البحوث کی پہلی مؤتمر کو سمجھنا چاہیئے۔

نہر سویز کی آزادی، اسوان بند، اسکندریہ کی بندرگاہ، مدیریۃ التحریر، مدینۃ النصر، مدینۃ العمال اور الازہر کی جدید تشارت، دار القرآن کی عظیم الشان عمارت کی تاسیس، المصحف المرتل کے ریکارڈ سارے اسلامی دنیا میں بھیجنا اور خود قاہرہ میں مخصوص ریڈیو کے اسٹیشن سے ۱۴ گھنٹہ قرآن کریم (المصحف المرتل) نشر کرنا، افریقہ کے ممالک میں ہزاروں مبلغ و معلم بھیجنا، جمال کی زندگی کے روشن کارنامے ہیں۔

الکلمات الطیّب

مصر سے واپسی پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک تقریر فرمائی جسے بروقت نوٹ کر لیا گیا اور اب وہ رسالہ دارالعلوم کے ایک ضمیمے میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات نذرِ قارئین ہیں مگر ساتھ ساتھ ہم بھی اپنی ناچیز معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بظاہر تو کہاوت "چھوٹا منہ بڑی بات" ہی کی صادق آئے گی کہ مولانا موصوف ٹھیرے ایک جلیل القدر عظیم المرتبت عالم جنھیں عام طور پر فخر الاماثل اور حکیم الاسلام کہا جاتا ہے اور ہماری حیثیت ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں — لیکن مولانا کی وسعتِ ظرف اور شفقت سے ہمیں توقع ہے کہ وہ اس جرأت کے لئے ہمیں معاف فرمائیں گے

سب سے پہلے ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ جو مقالہ مولانا نے قاہرہ کی موتمر اسلامی میں پیش فرمایا وہ اپنے علمی نکات اور نظریاتی لطائف کے اعتبار سے بہت پُر لطف ہے اور جو مشورے اجتہاد کے سلسلے میں انھوں نے اربابِ موتمر کو پیش کئے ہیں وہ نہایت مستقیم اور متوازن فکر پر مبنی ہیں۔ اگر اس موتمر کے اجلاس کو ایک مشاعرہ فرض کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے کہ مولانا موصوف کا مقالہ حاصلِ مشاعرہ ہونا چاہیئے۔

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا ہے کہ اس موتمر سے موصوف نے جس حسنِ ظن اور جن توقعات کو وابستہ کیا ہے ان کی کوئی بنیاد خارج میں موجود نہیں اور انھیں تمناؤں کی گلکاریوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ ہمارے علمائے ہند بہت دنوں تک مصطفےٰ کمال پاشا کے بارے میں بھی سادہ لوحی کا شکار رہے ہیں اور اگر وہ بندۂ خدا اپنے الحاد و زندقہ میں بالکل ہی ننگا نہ ہو جاتا بلکہ ایسی ہی لیپا پوتی سے کام لیتا جیسی آجکل کے اکثر مسلمان ملکوں میں ذہنی الحاد و ارتداد کے علمبردار حکمراں اختیار کئے ہوئے ہیں تو آج بھی اس زندیق کو غازی

اور رحمۃ اللہ علیہ کہنے والے بہت سے علماء مل جاتے۔ مصر یا عراق وشام یا پاکستان کے بارے میں بھی ویسی ہی سادہ لوحی کی رواج چل رہی ہے مگر تعجب اس پر ہے کہ اس کا شکار بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کی بالغ نظری کے بارے میں یہ خوش گمانی کی جاسکتی تھی کہ وہ سانپ کو بل کے اندر ہی پہچان لینے کی مہارت تامہ رکھتے ہوں گے۔

اشتراکیت کا دفاع

حضرت مہتمم صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا:-

"یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کرلی گئی ہے اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں اوّل تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لفظ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کے بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں، جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا کمیونزم کا نہیں ہوگا اس لئے ایسی اشتراکیت وعمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے کمیونزم نہیں کہلائی جاسکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کے ناقص فکر اور جذباتی زور کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کردیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائیگا۔ قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصہ جسے مصر جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے وہ کل وشتیں صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشنلائز کردیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہرحال شخصی املاک کی افراط کو جو حدودِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بُرا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو ختم کرکے حدودِ اعتدال میں لے آنا قابلِ ملامت نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابلِ ستائش کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال موتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔"

ہم نہیں جانتے کہ اس اسلوبِ کلام اور طرزِ استدلال کو علم ومتانت کے کس خانے میں رکھیں۔ مولانا نے افواہاً ایک بات سُنی اور فکر ونظر کے تمام سنجیدہ تقاضوں کو نظر انداز کرکے فوراً اتنا بڑا فیصلہ صادر کردیا کہ البانی عورت کی جائداد کو قومیا لینے میں جمال عبدالناصر کا اقدام یکسر حق بجانب تھا۔

اولاً تو یہی بات لائق تحقیق تھی کہ جو کچھ مولانا کے "کانوں میں پڑا ہے" وہ کس حد تک مطابقِ واقعہ ہے۔ کوئی البانی عورت کیا سچ مچ چوتھائی مصر کی مالک تھی یا یہ بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جیسے بےشمار افسانے اشتراکیت کے دلدادہ ممالک میں گھڑے گئے ہیں اور گھڑے جاتے ہیں۔ پھر مان لیجئے اس افواہ میں صداقت ہی ہوتی تب بھی قابلِ توجہ پہلو یہ تھا کہ اتنی بڑی جائداد ایک عورت نے کن ذرائع سے پیدا کی۔ اس کے بعد یہ دیکھنا تھا کہ اس جائداد کی "ضبطی" کن اصول وقواعد کے تحت ہوئی۔ ہمیں کسی ایسے اسلام کا علم نہیں جو یہ اجازت دیتا ہو کہ ہر بڑی جائداد کو فقط اس دلیل سے ضبط کرلیا جائے کہ وہ "بڑی" ہے۔ ہوسکتا ہے ایک بڑی جائداد سراسر مباح وحلال ذرائع سے پیدا کی گئی ہو۔ ہوسکتا ہے کچھ حصہ حلال اور کچھ حرام وسائل کا رہینِ منت ہو۔ کیا

اسلامی نقطۂ نظر سے اس پوری جائداد کے ساتھ وہی معاملہ جائز اور منصفانہ ہوسکتا ہے جس پر مصر عمل پیرا ہے۔

بے شک سرمایہ داری اور جاگیرداری کی بعض مفرط اور ظالمانہ شکلوں کو اسلام بھی ناپسند کرتا ہے لیکن انکی اصلاح و تطہیر کے لئے جو اصول و قوانین وہ دیتا ہے انھیں یکسر نظر انداز کرکے ہم اگر مصطلحہ اشتراکیت کے اصول و قوانین کام میں لائیں تو اسی کو فکری ارتداد اور اسلام سے بغاوت کہا جائے گا۔ کن چیزوں پر کب کسی فرد یا گروہ کا حق ملکیت قائم ہوتا ہے اور کب اس حق کو سلب کرلینے کا جواز پیدا ہوجاتا ہے اس باب میں اسلام گونگا بہرا نہیں ہے وہ اپنے مستقل قوانین اور اصول و نظریات رکھتا ہے۔ جائدادیں تو میانے ——— یا صحیح تر الفاظ میں ضبط کرنے کا عمل کب اسلام سے مربوط ہے اور کب کمیونزم سے اس کا فیصلہ اسی طریقے پر ہوسکتا ہے کہ ہم دیکھیں کن اصول و قواعد کی بنیاد پر یہ اقدامات اُٹھائے جارہے ہیں۔ حکومت کا سرکاری مذہب اسلام قرار پانے کے چٹکلے سے اگر ہم جیسے عامی دھوکا کھا جائیں تو تعجب نہیں لیکن حکمائے زمانہ بھی اس سے مسحور ہوجائیں یہ حیرتناک ہے۔ موٹر اور ہوائی جہاز کے متعدد پرزے ایک دوسرے کے ہمشکل ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن انھیں اَدَل بدل کر استعمال نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ اپنی ٹھیک جگہ فٹ ہوکر ہی صحیح کام دے سکیں گے اسی طرح اشتراکیت اور اسلام کے بعض اصول و قوانین میں صوری مشابہت ہوسکتی ہے لیکن سوائے سطح بینوں کے اس مشابہت سے کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ مولانا اگر مصر کے جدید آئین و دستور پر نظر ڈالیں تو اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہ ہوگا کہ جس اشتراکیت کا جوڑ وہ اسلام سے لگارہے ہیں وہ دراصل ایک ایسی مشین کا پرزہ ہے جو اسلام کو مغربی افکار و اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے بنائی گئی ہے اور اس کا سب سے بڑا کام ہی یہ ہے کہ قرآن و سنت والے اسلام کو توڑ مروڑ کر ایک ایسی شکل دیدے جو کامل طور پہ "یورپین اخلاق" اور مغربی تہذیب و ثقافت کی ترجمان ہو۔ کتنا سطحی اور بے مغز ہے یہ کہنا کہ :-

> "مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کردیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا"

گویا مولانا نے نقطۂ البانی عورت ہی والے معاملے کو نہیں بلکہ تمام ان معاملات کو اسلامیت کی سند عطا کردی جن کا شمہ برابر علم انھیں نہیں ہے۔ کاش وہ غور فرماتے کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں۔

اس پر بھی تعجب ہی کرنا چاہیئے کہ مولانا ایک سے زائد بار اس اعلان کو دہرلتے ہیں کہ مصری حکومت کا مذہب اسلام ہوگا نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔ کیا کوئی بھی اہل نظر اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ مغربی درسگاہوں کے تربیت یافتہ حضرات اسلام کن معنوں میں بولتے ہیں۔ انکے یہاں ہر وہ چیز عین اسلام ہے جسے وہ پسند کریں حتیٰ کہ زنا، قمار اور سود والی تہذیب و ثقافت کو بھی وہ بہانگ دہل اسلامی ثقافت سے تعبیر کرنے لگے ہیں اور تازہ نظیر پاکستان کی موجود ہی ہے کہ وہ عائلی قانون بھی عین اسلامی ہی قرار پایا جو صریحاً اور بداہتہً اسلامی اصول و نظریات سے انحراف اور قرآنی تعلیمات سے بغاوت پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی حکیم الاسلام معانی و مفاہیم کو نظر انداز کرکے نقطِ الفاظ اور نعروں پر نقد و نظر کے زاویئے بناتا ہے تو لغت میں حکمت کے ایک نئے معنی درج کرنے ہوں گے۔

نیم نگاہی!

مولانا توصیف و تحسین کی ایک مفصّل تصویر کھینچنے کے بعد فرماتے ہیں :-

> "مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کیلئے ان ساری مسرتوں کے ہجوم میں کوفت اور سوہانِ روح کا سبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہوجانا ہے، جب تک

ان کے مظاہر اور ما فی الضمیر کا اندازہ نہ ہو ظاہری طور پر قاہرہ اور پیرس و لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے جہاں مساجد نمازیوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دے گا۔ نمازیں بھی پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر آداب شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں، ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسّس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے۔ عورت مرد کا اختلاط عام ہے۔ جلسوں، بازاروں اور دفتروں حتیٰ کہ مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔ جامع ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا حلقہ مستقل تھا جس میں وہ کھلے منھ شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظر عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ سلی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن گو بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے لیکن اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے۔ اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔ تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جاتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں، اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے، ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جا رہی ہو کیونکہ قدیم فقہ قطعاً بہت سی جدید

جزئیات پر قیود و بندھ عائد کرتا اور توسعات میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے، حالانکہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے، صاف بات مغربیت سے مرعوبیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔"

شکر ہے کہ مدح و توصیف کے سیلِ رواں میں تھ مرت کی بھی کوئی رو نظر تو آئی۔ تعجب اس پر ہے کہ معاشرے کا یہ رنگ دیکھنے اور محسوس کرنے کے باوجود مولانا کا ذہن رسا صورتِ حال کی حقیقی ہولناکی اور مرض کی شدت اور گہرائی تک نہیں پہنچ پایا۔ کون نہیں جانتا کہ مرد و زن کی مخلوط سوسائٹی اور مرد و زن کی مساوات کے جلوے اس مغربی تہذیب و تمدن کا سب سے اُبھرا ہوا مظہر ہیں جس کا خمیر روح دشمنی اور خدا بیزار مادیت سے اٹھا ہے۔ اگر مولانا نے جمال عبدالناصر کا سن باسٹھ والا قومی منشور نہ بھی پڑھا ہو، اگر اصلاح و ترقی کے نام پر اٹھائے گئے وہ تمام اقدامات جن سے مصر کی موجودہ قیادت کا ذہن اور طرزِ فکر کھل کر سامنے آ چکا ہے مولانا کی نظر سے نہ بھی گذرے ہوں تب بھی سوسائٹی کا متذکرہ رنگ ڈھنگ دیکھنے کے بعد یہ یقین کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے تھا کہ مصر کی حکومت بھی پورے قصد و عزم اور شعور کے ساتھ اس مغربی فلسفۂ زندگی کو اپنا چکی ہے جس کے ساتھ اسلامی فلسفۂ زندگی کا جمع ہونا کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔ اس یقین تک پہنچ جانے کی صورت میں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ مولانا مصری نیشنلزم کو "اسلامی اشتراکیت" سے جوڑنے کی سعی فرماتے اور ایسے حسنِ ظن کا مظاہرہ کرتے جس کی تردید و تضحیک مصر کی سیاست و معاشرت کا ہر ہر گوشہ کر رہا ہے۔

یہ کہنا کہ :-

"اغیار کا تمدن گو بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے، لیکن اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر لازمی ہے"

غیر معمولی سادہ لوحی کا مظاہرہ ہے۔ گویا مولانا خیال فرماتے ہیں کہ جس تمدن کے نظارے انھوں نے دیکھے اسے مصر نے بس یوں ہی غیر شعوری طور پر اختیار کر لیا ہے اور اب اندیشہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کے فکر و نظر متاثر ہو جائیں گے۔ حالانکہ ترتیب یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے کہ پہلے فکر و نظر ہی میں تغیر آیا ہے۔ پھر اس کے نتیجے میں مغربی تمدن کا ایوان تعمیر کیا جا رہا ہے۔

جمال عبدالناصر کے پیش نظر اسلامی تصورِ حیات کو مکمل طور پر مٹانے اور قوم پرستانہ مادیت کے ظاہر فریب فلسفے کو نہ صرف مصر بلکہ پورے عرب پر پھیلا دینے کا جو سوچا سمجھا مربوط و منضبط منصوبہ ہے اس کا صاف صاف اظہار وہ اپنے اس قومی منشور میں بھی کر چکے ہیں جو ابھی سنہ ۶۲ء میں سامنے آچکا ہے۔ انھوں نے صریح لفظوں میں موجودہ معاشرے کو ایک ایسے معاشرے میں بدل دینے کا عزم ظاہر کیا تھا جو :-

"جو اپنے لئے ایسے نئے اجتماعی تعلقات اور روابط انتخاب کر سکے جن پر نئی اخلاقی قدریں استوار ہو سکیں اور ایک نئی وطنی ثقافت کے ذریعہ ان کا اظہار ہوتا ہو"

ایسی سوسائٹی جو :-

"جو حریت اور اتحاد کو زندگی کی اساس اور جد و جہد کے اعلیٰ مقاصد یقین کرتی ہو"

اور :-

"مصری جد و جہد کی جڑوں کو وہ فرعونی تاریخ میں تلاش کرے جو مصری اور انسانی تہذیب کے سب سے اولین بانی رہے ہے"

جمال عبدالناصر کی نگاہ میں اسلام کو دوسرے مذاہب پر کوئی برتری نہیں بلکہ وہ سارے ہی مذاہب کو ایک صف میں اور ایک سطح پر رکھتے ہوئے کہتے ہیں :-

"مذہبی عقیدے کی آزادی کا تقدس ہماری نئی اور جدید زندگی میں باقی رہنا چاہیے۔ لازوال روحانی قدریں جو مذاہب سے پیدا ہوتی ہیں وہ انسان کی ہدایت اور اس کی زندگی کو ایمان کے نور سے روشن کرنے اور خیر، حق اور محبت کے لئے لامحدود قوتیں عطا کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۱؎"

اب کیا ہم یہ بھی تشریح کریں کہ جن نئی اخلاقی قدروں کو سوسائٹی میں مقبول بنانے کا عزم جمال عبدالناصر رکھتے ہیں وہ کیا ہیں —— عورتوں کی کامل آزادی —— ایک سے زیادہ نکاح کی حرمت —— وراثت میں عورت کا مرد کے برابر حصہ —— انفرادی ملکیت کا خاتمہ —— قوم و وطن کی پرستش —— وعلیٰ ہذا القیاس۔

مولانا لکھتے ہیں کہ :-

"قدیم فقہ یقیناً بہت سی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کر اور توسعات میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے"

اس سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا فساد کے صحیح کم و کیف کا احساس نہیں فرما سکے ہیں —— کیا مادہ پرستانہ طرزِ زندگی اور فحاشی و عیاشی پر مبنی معاشرت کا معاملہ "جزئیات" کے دائرے کی چیز ہے اور کیا اس کی اہمیت اتنی کم ہے کہ ہم بجائے قرآن و سنت اور اصولِ اسلام کے اسے کسی قدیم یا جدید فقہ سے وابستہ کریں۔ کیا غضب ہے کہ جو مظاہر صریح طور پر ذہنی ارتداد اور فکری الحاد و زندقہ کا اعلامیہ ہیں انھیں ایک جلیل القدر مبصر "جزئیات" کا نام دے اور قدیم فقہ سے جوڑے۔ ہم مشورہ دیں گے کہ مولانا اس ہولناک اور ہمہ گیر کشمکش کا بغور مطالعہ فرمائیں جو تقریباً تمام ہی عالم اسلام میں دین اور بے دینی، مادیت اور روحانیت، اسلام اور الحاد کے مابین برپا ہے۔ اس کشمکش میں عوام جذباتی طور پر دین کے طرفدار ہیں لیکن مغرب گزیدہ حکمراں اور جدید تعلیم یافتہ

۱؎ یہ اقتباسات مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی بیش بہا کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" سے لئے گئے۔ ج

علیٰ کھلم کھلا الحاد و مادیت کے حامی ہیں۔ اس حمایت کی پشت پر چونکہ طاقت ہے اس لئے اسلام شکستوں پہ شکستیں کھا رہا ہے اور عوام بھی چار و ناچار ایک ایسے رُخ پر بہے چلے جا رہے ہیں جو خدا بیزاری، لذّت پرستی، رُوح دشمنی اور ہلاکت کا جانا پہچانا رُخ ہے۔

شفقت!

حضرتِ محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بہر حال میں نے مصر ہو چکا اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کرکے جو کچھ اندازہ لگایا، میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، اس غلبے سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر و مغلوب ہو چکا ہے کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو وہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کے ساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو وہاں کی قدرتی آب و ہوا کا نتیجہ ہے دونوں کی مضبوطی نے انھیں استحکام اور قیادت کے رستے پر ڈال دیا ہے اور وہ زادہ بسطۃً فی العلم والجسم کے مصداق ہو کر احق بالملک کے مقدار بن گئے ہیں، اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا فروغ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا جائے گا اور بالخصوص مڈل ایسٹ کے ممالک کو ان کی اٹھائی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔ ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلاشبہ ان کے حسن تدبر کی قابلِ ستائش مثال ہے۔"

اسے ہم "شفقت" نہ کہیں تو آخر کیا کہیں۔ دق کو جو طبیب نزلہ کہے اور کینسر کو ایک معمولی پھوڑا۔ اسے بے بصیرت بھی کہا جا سکتا ہے لیکن وہ اگر مسلمہ طور پر "حکیم" ہو تو اس کی تشخیص کو "شفقت" کا نام دیں گے۔ ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا تھا:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ترکی میں "اسلام" کا جو حال ہو چکا ہے وہ کوئی پرانا قصہ نہیں۔ اب تمام عالم اسلام میں عموماً اور مصر میں خصوصاً جو رویہ اس غریب مذہب کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے وہ اپنی رفتار اور مقدار کے اعتبار سے بالکل ترکی جیسا نہیں لیکن اسپرٹ، تکنیک، مقاصد اور ثمرات و نتائج کے اعتبار سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ اسکے باوجود حضرت مولانا جیسا مبصر اسے بالکل معمولی اور ناقابل تشویش قرار دیتا ہے تو پھر کس سے امید کریں کہ وہ زخموں سے چور اسلام کی کراہوں اور فریادوں پر کان دھرے گا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ خوارج بڑے عبادت گذار تھے، بے حد متقی، زاہد اور خدا پرست، لیکن ان کے عقائد کا ذرا سا بگاڑ یہ رنگ لایا کہ آج ہمارے علماء انھیں خارج از اسلام قرار دے کر ان کی کسی بھی نیکی اور خوبی کو خراج تحسین دینے کے روادار نہیں۔ ان کے بارے میں کوئی حکیم دانا صفائی کا یہ انداز اختیار نہیں کرتا کہ "خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے"

لیکن وہ مصری حکمراں جنھوں نے شاہراہ عام پر فرعون کے بت نصب کئے ہیں، جنھوں نے اعلانیہ مغربی فلسفۂ زندگی کو اپنایا ہے، جو کھلم کھلا اسلام کی تحریف کے علمبردار ہیں، جو اسلامی قوانین اور اسلامی اخلاق کو ببانگ دہل فرسودہ، ردّی اور ناکارہ قرار دے رہے ہیں، جن کو اصرار ہے کہ تمام مذاہب برابر ہیں اور اسلام کو

کوئی برتری حاصل نہیں جنھیں حضرت موسیٰ کے بالمقابل فرعون سے اس لئے ہمدردی ہے کہ وہ ان کا قومی ہیرو تھا۔ جن کے فکر و عمل اور ذوق و میلان کا رُخ کھلم کھلا قبلۂ مغرب کی طرف ہے جن کے مستند ادیب بلا تکلف کہتے ہیں کہ:۔

"ہمیں اہل یورپ کے طریقے پر چلنا چاہیئے اور ان کی سیرت و عادات اختیار کرنا چاہیئے تاکہ ہم ان کے برابر ہو سکیں اور تہذیب کے خیر و شر، تلخ و شیریں، پسندیدہ و ناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیق کار اور شریک حال ہو سکیں"

اور

"ہم ایک یورپین کو باور کرا دیں کہ اشیاء کو ہم اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے ایک یورپین دیکھتا ہے، ان کی وہی قدر و قیمت ہماری نظر میں ہے جو اس کی نظر میں ہے ہم ان کے متعلق وہی رائے قائم کرتے ہیں جو ایک مغربی کرتا ہے"[1]

جن کا نیا معبد "مادی مفادات" اور قوم و وطن کے ڈھنڈورا دیوتا ہیں، جو سیاست، تشدد اور مکر کے تمام ممکنہ حربوں سے پرانے اسلام کا سانچہ توڑ پھوڑ کر ایک نیا سانچہ بنانے کے درپے ہیں جس کا نام تو وہ اسلام ہی رکھے رہیں گے لیکن ہوگا وہ سرتاپا مغربی تصورِ حیات کا سانچہ جس میں نماز روزہ بھی ایک سا مشغلہ پروگرام سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھیں گے ــــ بشرطیکہ سیاستہً ان کو زندہ رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ جن کی شاہراہِ حیات اسلامی شاہراہ سے بالکل جدا ہے، جن کے مقاصد، مراحل، عواطف، افکار سب علیحدہ ہیں ــــ ان کے بارے میں مولانا کا یہ مشفقانہ اور ملتین تبصرہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ زنا بے شک جرم ہے مگر بس اتنا کہ زانی اور زانیہ کے گالوں پر ایک ایک چپت مار دینا کافی ہوگا۔

پوری تقریر دیکھ جائیے۔ مولانا نے مصریوں کے ملی شعور سیاسی سوجھ بوجھ، تعلیم، شائستگی، سلیقے اور ذہانت وغیرہ کو خوب سراہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اوصاف ستائش کے مستحق نہیں ہیں لیکن ستائش کا جذبہ سرد آہوں میں تبدیل ہو سکتا تھا اگر مولانا اس سامنے کی حقیقت کو محسوس فرما لیتے کہ موجودہ عالم اسلام میں ایسے تمام اوصاف کا سرچشمہ اور مصدر و منبع اسلام نہیں ہے بلکہ وہی مغربی تصورِ حیات ہے جس کی چمک دمک، بناؤ سنگار، رکھ رکھاؤ، ملمع کاری اور مادی ترقیات کے نوع بہ نوع جلووں سے کوئی بھی ذی ہوش بے خبر نہیں ہے۔ اس تصورِ حیات کی بعض خوبیوں کا انکار سورج کا انکار ہوگا لیکن جو بنیادی خرابیاں اس کا جزوِ لاینفک ہیں ان کی شر انگیزی، مضرت رسانی اور ہلاکت خیزی کے مقابلے میں یہ خوبیاں دو کوڑی کی بھی نہیں۔ اس درخت کے برگ و بار ہر لحاظ سے معلوم و معروف ہیں۔ ان کے منافع اور مضرتیں۔ ان کے اجزاء و عناصر ان کا ظاہر اور باطن۔ کیا ہے جو چھپا ہوا ہے۔ پھر بھی اگر مشرق کا ایک حکیم صرف رنگ روپ پر ریجھ جاتا ہے اور اندر چھپے ہوئے ــــ بلکہ نس نس میں سمائے ہوئے زہر سے صرفِ نظر کر لیتا ہے تو اسے ایک ہولناک ٹریجڈی کے سوا کیا کہیں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ کون مومن ایمان باللہ اور اخلاقِ اسلامی کی قیمت پر ان اوصافِ حمیدہ کا سودا سستا خیال کر سکتا ہے جن کے نظارے نے مولانا کو مسرت اور سرخوشی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ہمیں تشویش اور اضطراب ہے کہ ہمارے مہتمم صاحب جیسے مردِ زیرک نے ابھی تک اس بلا خیز طوفان کی ہولناکی، ہمہ گیری اور خروش و شدت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے جو تمام عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور بدقسمتی سے مصر اس طوفان کے آگے گھٹنے ٹیک دینے میں پیش پیش ہے۔

کچھ مولانا بنّوری کی خدمت میں

شروع میں جو کچھ ہم نے "بیّنات" سے نقل کیا ہے اس پر کہیں کہیں حاشیہ کا نمبر دے کر ہم نے علیحدہ کاغذ پر کچھ حواشی لکھے تھے لیکن کاتب صاحب نے نہ جانے کس عالم میں یہ کاغذ تو نظر انداز کر دیا اور بغیر حواشی کے اقتباس

---

[1] ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔

نقل کر ڈالا۔ اس فروگذاشت کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب وہ "الکلمات الطیب" بھی کتابت فرما چکے تھے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ چند ضروری باتیں بعد ہی میں عرض کردی جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے علماء کی دینی پختگی، جرأت اور قوتِ ایمانی کے سلسلے میں جن علماء کے اسماءِ گرامی تمثیلاً لئے گئے وہ سب کے سب وہی ہیں جو اپنی مدتِ حیات پوری کرکے دوسری دنیا کو سدھار چکے۔ بے شک یہ سب ایسے ہی تھے کہ انھیں نمونے اور نظیر کے طور پر پیش کیا جائے، لیکن کیا مولانا بنوری کو یقین ہے کہ ہمارے آج کے زندہ علماء بھی اسلاف کی امانت کا حق ادا کر رہے ہیں اور من حیث المجموع ان کے کردار اور اوصاف و خصائص پر ویسا ہی فخر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ مولانا کی تحریر سے ظاہر ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ دینی تصلّب، جرأتِ حق گوئی، حرارتِ ایمانی اور اسلام کی خاطر کچھ کر گذرنے کا جذبہ اور تڑپ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کا زوال اور فقدان کی حد تک انحطاط علماءِ ہند و پاک میں بھی صاف نظر آرہا ہے مستثنیات سے بحث نہیں۔ استثناء تو مولانا نے ممالکِ عربیہ کے علماء میں بھی کرہی دیا۔ عام کیفیت یہ ہے کہ ہر عالم، ہر استاذ، ہر شیخ اپنی ایک محدود دنیا لئے بیٹھا ہے جس کے دائرے میں خود پروری، خود پسندی، گروہی عصبیت، مفاد پرستی اور فروعی اختلافات کی چہل پہل تو روز افزوں ہے لیکن دین و ملت کے ہمہ گیر سود و زیاں کا احساس اور اسلام کی راہ سے کانٹے ہٹانے کی لگن معدوم ہوتی جارہی ہے۔ ساری توانائیاں باہمی جنگ و جدل میں کھپ رہی ہیں اور ذرا ذرا سے ذاتی مفادات پر دین و ملت کے نمایاں تقاضوں کو پامال کیا جارہا ہے۔ اگر ہم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں ـــ یا دوسرے لفظوں میں خود تنقیدی سے کام لیں تو صاف نظر آجائے گا کہ ہمارے یہاں بھی وہ سارے خصائص و محامد سرعت سے روبہ زوال ہیں جن کے سلسلے میں ہم بجا طور پر سلف کا نام فخر کے انداز میں لیتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا نے عظیم الشان پنڈال اور قالینوں وغیرہ کا ذکر تو کیا لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی نگاہ میں یہ شاہ خرچی اسراف و تبذیر کے زمرے میں شمار ہونی چاہئے یا اکرامِ ضیف اور مہمان نوازی کے عنوان سے اس کی تعریف کرنی چاہئے۔

تیسری اور آخری بات یہ کہ دینی اعتبار سے ترقیِ معکوس کی جو نشاندہی مولانا نے کی ہے اور اسلام کے حق میں جس مزید پسپائی اور انحطاط کا احساس انکے ریمارک میں جھلک رہا ہے اس کا علاج آخر کیا ہو؟

آسان صورت تو یہی ہے کہ چار ٹھنڈی آہیں بھرلیں اور چند حسین تمناؤں کا وقتاً فوقتاً اظہار کر دیا کریں۔ قلب و ضمیر کو تسکین دینے کا ایک ذریعہ ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر بھی ہو سکتا ہے

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

لیکن کیا یہ طرزِ فکر ہمیں آخرت کی جوابدہی سے بچا لے جائے گا؟ کیا نائبینِ رسولؐ کا فریضہ بس اتنے ہی پر تمام ہو جاتا ہے کہ انھوں نے چند آنسو ٹپکائے، چند آہیں بھریں اور چند وعظ کہہ ڈالے یا اس سے بڑھ کر جان و مال کی قربانی اور طاغوتی قوتوں سے مسلسل پیکار و ستیز بھی ان کے فرائض میں شامل ہے۔

یہ جو کہا گیا کہ:۔

"میرے خیال میں اگر کوئی اولو العزم باوقار محقق عالم اور دینی مفکر حسن تدبر کے ساتھ صحیح طریقے پر جمال عبدالناصر کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو شاید یہ سعی مثمر ہوتی"

تو گستاخی معاف یہ گہرے تدبر اور ژرف نگاہی پر مبنی نہیں۔ ایک درخت جو زمین میں جڑیں پھیلا کر تناور

ہو چکا ہے اور پھل دے رہا ہے کیسے ممکن ہے کہ محض کسی واعظ کے وعظ اور خطیب کے خطبے سے اس کے پھل بدل جائیں - وہ نمولی کے عوض انگور دینے لگے -

جمال عبدالناصر ہوں یا ممالک اسلامیہ کے دوسرے مغرب گزیدہ سلاطین ووزراء - ان کا تجدد اور مادہ پرستانہ انداز نظر کوئی اتفاقی حادثہ اور وقتی ہیجان نہیں ہے بلکہ عرصۂ دراز کی محنت و ٹریننگ کے بعد انکے ذہنی سانچے تیار ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اسکی پشت پر تربیت پایا ہوا عزم و شعور ہے - جذبہ اور لگن ہے - فلسفہ اور استدلال ہے - یہ جس راہ کے مسافر ہیں اسکا سرا بہت پیچھے جا چکا - اب یہ جہاں پہنچ چکے ہیں وہاں کوئی موڑ ایسا نہیں جو منزل اسلام کی طرف لیجاتا ہو -

دُرِّ نجف سُرمہ

غیر معمولی مقبولیت کا راز صرف یہ ہے کہ وہ تقریباً بیس سال سے یکساں خدمات انجام دے رہا ہے

مریض آنکھوں کیلئے صحت

اور

صحتمند آنکھوں کے لئے بینائی کی حفاظت

یہ ہیں دو کام جن میں اس سرمہ نے کبھی کوتاہی نہیں کی -

کوئی سی بھی تین شیشی یکجا طلب کرنے پر ڈاک خرچ **معاف**

ایک تولہ - پانچ روپے
چھ ماشہ - تین روپے
ڈاک خرچ - ڈیڑھ روپیہ

دارالفیض رحمانی
دیوبند (یوپی)

حضرت شاہ ولی اللہ رح کی چار کتابیں
اُردو لباس میں

خیر کثیر معرفت و طریقت کے گہرے علوم پر شاہ صاحب رح کے بلیغ رشحات فکر - اصل کتاب کا عربی متن بھی ترجمے کے ساتھ ہے - مجلد چھ روپے -

فیوض الحرمین یہ کتاب بھی شاہ صاحب رح کی منتخب کتابوں میں گنی گئی ہے - اس میں بیشمار علمی جواہر کے ساتھ تقلید کے بارے میں شاہ صاحب رح کا مسلک بھی مفصلاً ملتا ہے - عربی متن ساتھ ساتھ -
قیمت مجلد ساڑھے چار روپے -

بلاغ المبین شرک و بدعت کے رد اور توحید و سنت کے اثبات میں معرکۃ الآراء کتاب - خرافات و ہفوات کی بیخ کنی - چار روپے -

تحفۃ الموحدین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں توحید کے خدوخال نکھارے گئے ہیں - شرک کی تفصیلات اور ان کا رد - فارسی متن ساتھ ساتھ ہے - قیمت ۶۳ پیسے

حافظ امام الدین رام نگری کی چند کتابیں

حقیقت جزیہ جزیہ پر کئے گئے اعتراضات کا شافی جواب - ۵۸ پیسے -

آواگمن کا تحقیقی جائزہ تناسخ کے عقیدے پر خود حاملین تناسخ کی کتابوں سے گفتگو - لاجواب دلائل - تحقیقی مواد - ایک روپیہ

عقیدۂ آخرت کے دلائل دوسرے تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے عقیدۂ آخرت کی صحت پر تسلی بخش مواد - ۸۰ پیسے

خاصان خدا کا خوف آخرت رسول اکرم اور صحابہ کرام کے رقت انگیز حالات - خاصے کی چیز - ایک روپیہ

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

مشینی ذبیحہ

از ڈاکٹر محمد نسیم - ایم - بی - بی - ایس ۱۲ سالسبری روڈ -
برج فیلڈ برمنگھم ۱۹ (انگلینڈ)

محترمی عامر صاحب! السلام علیکم -

ایک مقامی اخبار میں شائع شدہ استفسار، فتویٰ اور اس ضمن میں اپنا اظہار خیال بھیج رہا ہوں - اس کا پس منظر یہ ہے کہ یہاں مسلمان اپنے طریق پر ذبح کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور اللہ کے فضل سے مقامی ذبح خانوں میں اُن کو اسکی اجازت حاصل ہے، لیکن بعض مقامات پر انگریز اس اجازت اور رواداری کو بطیب خاطر قبول نہیں کئے ہوئے اور اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اس کو ختم کر دیا جائے - کسی کے مذہب میں حائل ہونا چونکہ ان کی روایات میں شامل نہیں ہے اس لئے اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ خود مسلمانوں ہی میں سے کسی ایسے فرد کی رائے کو آڑ بنایا جائے جو ان کے نزدیک ایک مذہبی مقام رکھتا ہے - میں نے جو جواب لکھا ہے وہ محض ایک ڈاکٹری حیثیت سے لکھا ہے - کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید یوں بحث آگے نہ بڑھے (واللہ اعلم) لیکن بہر حال اس کا بھی احتمال ہے کہ بات چل نکلے میرے پاس وقت، مطالعہ اور مواد سبھی کمیاب اور خام ہیں اسلئے شاید فقہی نکات پر کوئی سیر حاصل بات نہ کر سکوں - اسلئے آپ سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں مدد اور رہنمائی فرمائیں - میرے پاس یہاں قرآن حکیم کے چند تراجم اور بخاری کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر کتاب نہیں جس سے استفادہ کر سکوں - پاکستان سے کتب منگوائی ہیں مگر اسکے آنے میں کافی وقت لگ جائے گا - اس مسئلے کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالات کے آگے یوں سر ٹیکنے کی عادت کو اگر روکا نہ گیا تو اس کے سامنے پھر مسلمانوں کی کوئی مسئلہ جیسے بھی ٹھیر نہ سکے گی - اس سے پہلے علماء ازہر انگریزوں کے کاٹے ہوئے کو جائز قرار دے چکے ہیں - اب طفیل مہتمم صاحب اسی کو صرف چھری پھیر دینے پر جائز قرار دے رہے ہیں -

ایک بات میرے ذہن میں اور آرہی تھی کہ گولی سے جو شکار کیا جاتا ہے اس میں بھی اگر گولی جانور کے دماغ میں لگے تو اُس کو حرام ہی سمجھنا چاہئے - خواہ گولی تکبیر پڑھ کر ہی چلائی گئی ہو - میرے نزدیک اللہ کا نام لینا اور ذبح کرنے کا مسنون طریقہ دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں - اگر صرف اللہ کا نام لینا ہی ضروری ہوتا تو پھر سب سے آسان اور سیدھا طریقہ تو جھٹکے کا تھا، جسے رسول صلعم نے اختیار کر لیا ہوتا - میں سمجھتا ہوں کہ ایک کے فوائد نفسیاتی اور دوسرے کے جسمانی ہیں - واللہ اعلم اور دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن اپنے یہاں مسلمان شکار کھیلنے والوں کو اس بات کا التزام کرتے میں نے نہیں دیکھا کہ جانور کے سر کا نشانہ نہ لیں - یہ سہو ہے یا علماء نے اس معاملے میں سکوت اختیار کیا ہے - اس سے میں واقف نہیں ہوں - اگر ضمناً اس پہلو پر بھی اپنی رائے سے مطلع فرمائیں تو مشکور رہوں گا -

والسّلام

نسیم

حلال یا حرام؟ — فتویٰ شائع کیجئے

نیچے دیا ہوا فتویٰ ہمارے قصاب حضرات کو مقامی مذبح SLAUGHTER HOUSE کی طرف سے موصول ہوا ہے اور ساتھ ہی ہدایت کی گئی ہے کہ آئندہ مسلمان قصابوں کو بھی بجلی کی مشین سے STUN کئے ہوئے جانور استعمال کرنے ہوں گے۔ اس ہدایت سے مقامی مسلمان قصابوں کے لئے عجیب وغریب الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ اس امر کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں کہ آیا نیچے دیئے ہوئے فتوے کے مطابق ہم STUN کئے ہوئے جانوروں کو حلال کر کے مذہبی وقومی فریضہ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ لہٰذا ہم یہ مسئلہ علمائے کرام اور دیگر صاحب رائے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے توقع کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اس سلسلے میں مشترکہ فتوے شائع کر کے ہماری پریشانی دور کریں گے۔

جنرل سکریٹری
ہڈرسفیلڈ ——— پاکستان مسلم سوسائٹی

فتویٰ ——— یکم جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

جانور کش آلہ اور اسلامی قانون

اسلامی قانون کے مطابق خوراک کے لئے جانور اس طریق سے ذبح کرنا چاہیئے کہ اس کا تمام خون بہہ جائے اس قانون کی روشنی میں جانور کش آلہ کی مدد سے جانور کو STUN کرنے کا طریقہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے کیونکہ بجلی کے آلہ سے STUN کرنے کے بعد بھی جانور کافی دیر تک زندہ رہتا ہے اس لئے جانور کو بجلی کے آلہ سے ہلاک کرنے کے فوراً بعد اسلامی قانون کے مطابق اُسے ذبح کر لینا چاہیئے اس طرح جانور کی رگوں سے خون بہہ جائے گا اور وہ جانور اسلامی قانون کی رُو سے ذبیحہ قرار دیا جائے گا اور اس کا گوشت مسلمانوں کے کھانے کے لئے حلال ہوگا۔

دستخط محمد طفیل امام
شاہجہاں مسجد، ووکنگ (سرے) انگلینڈ

جانور کش آلہ اور اسلامی قانون

اس عنوان کے تحت محترم محمد طفیل امام شاہجہاں مسجد ووکنگ کا فتویٰ نظر سے گذرا۔ جہاں تک دینی معاملات میں رائے دینے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا حق علماء ہی کو پہنچتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ رائے فعل جسم کے سمجھنے پر مبنی ہے اس لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ اسکے متعلق جو کچھ علم طب سے ہمیں معلوم ہے وہ پیش کر دوں تاکہ خاص وعام مسئلے کی نوعیت پر غور کر سکیں۔

اگر یہ تسلیم ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق خوراک کے لئے جانور اس طریق سے ذبح کرنا چاہیئے کہ اس کا تمام خون بہہ جائے تو جانور کش آلہ کی مدد سے STUN کیا ہوا جانور اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کے جسم سے تمام خون بہہ سکے۔

ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ عرف عام میں جسے STUN یعنی سُن کرنا کہا جاتا ہے وہ در اصل گولی سے جانور کے بھیجے کو داغنے کو کہتے ہیں جس سے فعل جسم میں وہ حالت واقع ہو جاتی ہے جسے طبّی اصطلاح میں "صدمہ" کہا جاتا ہے۔ جب بھی دماغ کا فعل معطل ہو یا بگڑ جائے تو یہ حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک عارضی تعطل اسوقت بھی پیدا ہو جاتا ہے جب انسان کسی اچانک صدمے یا خوف سے دوچار ہو جائے لیکن گولی سے بھیجے کو بگاڑ دینا اختلال کی ایک انتہائی صورت ہے اور اسی لحاظ سے اس طرح سے پیدا شدہ صدمہ بھی ایک انتہائی اور غیر متبدل صورت رکھتا ہے۔

حالت صدمہ کے دیگر نتائج میں ایک نتیجہ یہ بھی شامل ہے کہ جاندار کے جسم کی چھوٹی چھوٹی اور مہین مہین وہ بیشمار نالیاں جو بالعموم بند رہتی ہیں اور استعمال میں نہیں آتیں بلکہ محفوظ ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں، پھیل جاتی ہیں اور ان میں خون داخل ہو کر بدن کے عضلات میں پھیل جاتا ہے۔ اپنے پھیلاؤ اور ضعف کے سبب یہ نالیاں اس قابل بھی نہیں

رہتیں کہ اس خون کو پھر گردش میں لوٹا سکیں - اس وجہ سے وہی خون جو پہلے بدن میں گھوم رہا تھا، اب بدن کے ریشوں اور پٹھوں کے درمیان اکٹھا ہو جاتا ہے نہ بہہ سکتا ہے اور نہ اس ذی حیات کے کام آسکتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہسپتالوں میں ان لوگوں کو جو گم چوٹ لگنے کی وجہ سے حالتِ صدمہ میں ہوتے ہیں - خون دیا جاتا ہے حالانکہ اُن کے بدن سے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہوا ہوتا بلکہ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ بدن میں خون ہوتا تو ہے لیکن گردش میں نہیں ہوتا - اس حقیقت کی طرف ہماری زبان کا ایک عام محاورہ دلالت کرتا ہے - چنانچہ بہت خوف یا صدمے کی حالت کو یوں ادا کیا جاتا ہے کہ "کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا" انگریزی زبان میں بھی اسی مفہوم کا محاورہ مستعمل ہے اور یہ سب انسانی مشاہدے کے اس تاثر پر مبنی ہے کہ اس حالت میں خون بہنے کے قابل نہیں رہتا -

اس حالت کے طاری ہونے کے بعد جو خون نکلتا ہے وہ صرف اسی قدر ہوتا ہے جو خون کی موٹی موٹی نالیوں میں رہ جاتا ہے اور اس سے تمام خون بہنے کا وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو اہلِ امام نے بیان فرمایا ہے - اس کے لئے ضروری ہے کہ خون کی نالیاں کٹی رہیں اور گردشِ خون کا نظام قائم رہے تاکہ بدن کا تمام خون سمٹ سمٹ کر اس کھلے راستے سے بہہ جائے - اس حالت میں موت تکلیف سے نہیں بلکہ ایک میٹھی نیند کی صورت میں واقع ہوتی ہے - کیونکہ اگر کسی ذی حیات سے دفعتاً بہت سا خون نکال دیا جائے تو اس پر سب سے پہلے جو حالت طاری ہوتی ہے اُسے عرفِ عام میں "غشی" کی حالت کہتے ہیں جس میں احساس جاتا رہتا ہے - گو بدن کی فعالیت باقی رہتی ہے - دوسرے تکلیف صرف اسی حد تک ہوتی ہے جب تک کہ چھری جلد تک رہے - جلد کے پار ہوتے ہی اعصابِ حِس راستے میں نہیں آتے اور نہ ہی تکلیف پہنچتی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں چھری کے تیز رکھنے اور ذبح کرنے سے پہلے جانور کو بے فکر اور خوش رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ خوف اور تکلیف کا عنصر باقی نہ رہے -

ڈاکٹر محمد نسیم

تجلی

یہ امر واقعہ ہے کہ جو مسلمان یورپ اور امریکہ و فرانس وغیرہ میں رہتے ہیں یا عارضی طور پر وہاں جاتے ہیں ان کے لئے خورد و نوش کا مسئلہ ایک مستقل الجھن بلکہ دردِ سر بن گیا ہے - حلال و حرام کے احساس اور تمیز سے بے تعلق ہو جانے والوں کے لئے تو کوئی دشواری نہیں، لیکن جن کی دینی حِس اور ضمیر ابھی تک زندہ ہیں وہ بہر حال اس تجسس اور تفتیش سے دستبردار نہیں ہو سکتے کہ دسترخوان پر ان کے سامنے جو کچھ آیا ہے وہ حرام ہے یا حلال - نجس ہے یا پاکیزہ -

اسی لئے مشینی ذبیحے کے جائز و ناجائز کی بحث وقتاً فوقتاً اٹھتی ہی رہتی ہے اور اہلِ فکر اپنی اپنی آراء پیش کرتے ہی رہتے ہیں - قدامت پسند علماء کا خیال ہے کہ یہ ذبیحہ بنیادی شرائط پورے نہ ہو سکنے کی بنا پر جائز نہیں ہے - جدت پسند علماء کی رائے ہے کہ اس کی حلت میں کوئی شبہ نہیں - "جدت" ایک ایسا مصدر ہے جس سے تجدید اور تجدد دونوں ہی مصادر تشکیل دیے جا سکتے ہیں لہٰذا یہ کہنا بھی مبالغہ آمیز ہی ہوگا کہ ہر جدت پسند عالم متجدد ہی ہے - ہو سکتا ہے اس کی جدت پسندی تجدید سے پیوند رکھتی ہو - اس صورت میں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ قدامت پسند ہی علماء کی ہر رائے درست اور جدت پسند علماء کا ہر خیال غلط ہے - دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کس نے دلائل کیا ہیں اور کس کا استدلال تقلیدِ جامد اور تنگ نظری کے عوض فکر و بصیرت اور وسیع النظری کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے - یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ قدامت کو عقل و تدبر اور نقد و تفقہ کے آگے ایسا دبیز پردہ بنا کر لٹکا دیا جائے جو تغیر پذیر حالات اور بدلتے ہوئے تقاضوں کی کسی بھی رو کو اندر جانے کی اجازت ہی نہ دے -

اسی طرح یہ بھی نہایت غلط اور مہلک ہے کہ تہذیبِ نو کے چمکیلے فلسفے اور ظاہر فریب نظریات سے مرعوب ہو کر بعض علماء قدامت سے بالکل ہی رشتہ کاٹ لیں اور

ان کا کام بس یہ رہ جائے کہ جو بھی نیا فعل اور طریقہ نئی تہذیب کے مراکز میں وقتی طور پر پسندیدہ قرار دیا جا رہا ہے اسے اسلام کی طرف سے سندِ تحسین دیتے چلے جائیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ دونوں ہی طرح کے علماء کے حلقوں میں بفرقِ مراتب تشدد، تعصب اور عدم تعاون کے جذبات نمایاں طور پر موجود ہیں اور ہر وہ مسئلہ جو ایک بار اختلاف کا مورد بن گیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کو متنازع بنکر رہ جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم صاف طور پر عرض کریں کہ بہت سے اور مسائل کی طرح مشینی ذبیحے کی حلت و حرمت کا مسئلہ بھی ایسا ہی مسئلہ ہے جو عدمِ تعاون بلکہ تقابل و تبارز کی موجودہ فضا میں کبھی بھی ایک طے شدہ مسئلہ نہیں بن سکتا۔ جو حرام کہہ چکے ہیں وہ حرام ہی کہتے رہیں گے خواہ انھیں پورے طور پر علم بھی نہ ہو کہ "مشینی ذبیحے" کی فنی حقیقت کیا ہے اور اس کی مختلف تکنیکوں میں کونسی تکنیک کس حد تک اسلامی شرائطِ ذبح سے متصادم ہے اور کس حد تک متوافق۔ جو حلال کہہ چکے ہیں وہ حلال ہی کا وظیفہ پڑھتے رہیں گے خواہ بعض مشینی طریقوں کی تکنیک صریح طور پر حلت کی قادح ہو۔

ہر ہوشمند سمجھ سکتا ہے کہ "مشینی ذبح" کسی ایک متعین طریقے کا نام نہیں ہو سکتا۔ مختلف اوقات میں مختلف ممالک نے ذبح کے کیا کیا طریقے اختیار کئے اس کا گہرا مطالعہ کئے بغیر کوئی حکم صادر کرنا ہوا میں تیر چلانا ہے۔ عین ممکن ہے کہ مشینی طریقوں میں بعض طریقے اسلامی اصولِ ذبح کے تقاضے پورے کر دیتے ہوں اور بعض اس سے قاصر ہوں لہٰذا ان کا حکم بھی مختلف ہوگا۔ بعض ایسے ہوں گے جن میں حلت اور حرمت دونوں ہی کی بنیادیں نظر آئیں گی اور اربابِ علم کے لئے اختلاف کی گنجائش نکل آئے گی۔ مثلاً یہی زیرِ تذکرہ طریقہ جسے STUN کا نام دیا گیا ہے دوراہے کا محل ہے۔ حلت اور حرمت دونوں کے لئے اس میں مواد موجود ہے۔ ہمارے محترم ڈاکٹر نسیم صاحب نے طبی نقطۂ نظر سے جو فاضلانہ تجزیہ پیش فرمایا ہے وہ بظاہر اس کا متقاضی ہے کہ یہ ذبیحہ حلال نہ ہو۔ "اراقۂ دم" یعنی ایک خاص مقدار میں خون بہانا ذبیحے کی حلت کے بنیادی اصولوں میں داخل ہے لہٰذا اراقۂ دم اگر مطلوبہ کیف و کم میں نہ پائی جائے تو ذبیحے کو حلال قرار دینا دشوار ہوگا۔ لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم فقہ میں بعض نظائر ایسے بھی موجود ہیں جو اراقۂ دم کے بغیر بھی ذبیحے کی حلت کا اطمینان دلاتے ہیں۔ مثلاً درمختار میں مسئلہ بیان ہوا کہ ایک مریض بکری ذبح کی گئی اور بوقتِ ذبح اس نے حرکت کی یا خون بہا تو وہ حلال ہو گئی بشرطیکہ بوقتِ ذبح اس کا زندہ ہونا شبہ سے بالاتر ہو۔ حتیٰ کہ:-

وان علم حیاتہ حلت مطلقاً وان لم تتحرك ولم یخرج الدم۔

اور اگر یہ بات جان لی گئی کہ ذبح کے وقت وہ یقیناً زندہ تھی تو اسے حلال مانا جائے گا چاہے بوقتِ ذبح وہ حرکت بھی نہ کرے اور خون بھی نہ بہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حلت کے لئے ہر حال میں اراقۂ دم بھی ضروری نہیں۔ البتہ بعض صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں ذبیحہ تو بجائے خود حلال ہو جائے لیکن طریقِ ذبح حرام یا مکروہ ہو۔ جیسے کھنڈی چھری سے حلق کی رگیں اور نرخرا کاٹ دینا۔ کھنڈی چھری کا استعمال حرمت کی حد تک مکروہ ہے لیکن شرطِ ذکات حاصل ہو جانے پر ذبیحہ بالیقین حلال ہوگا۔

جہاں تک مادی شرائطِ ذکات کا تعلق ہے مشینی ذبیحے کی حلت و حرمت پر اختلاف کی گنجائش پورے طور پر موجود ہے، لیکن ایک غیر مادی شرطِ ذکات بھی ہے جس کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا — یعنی ذبیحے پر خدا کا نام لینا۔ سورۂ انعام میں محکم طور پر فرمایا گیا ہے کہ:-

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ

اور مت کھاؤ وہ ذبیحہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو کیونکہ وہ تو فسق ہے۔

مستقل عنوان

مُلّا ابن العرب مکّی

مسجد سے میخانے تک

مُلّا اس ماہ غائب ہے۔ ہو سکتا ہے وہ پیران کلیر کے میلے میں جھک مار رہا ہو۔ ہو سکتا ہے تبلیغی جماعت کے چلّے میں نکل گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاتھ پیر تڑوا کر کسی ہسپتال میں پڑا ہو۔

یہ ریکارڈ ہے کہ "مسجد سے میخانے تک" کا عنوان جس دن سے شروع ہوا ہے آج تک ناغہ نہیں ہوا۔ اس ریکارڈ کو نبھانے کے لئے مجبوراً ایک مرحوم فیچر زندہ کیا جا رہا ہے۔ ہمت کیجئے مُلّا ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا ہو تو آئے گا اور انشاء اللہ تلافی مافات کرتا ہوا آئیگا۔ (ادارہ)

میں بڑی سے بڑی مصیبت خندہ پیشانی سے جھیل سکتا ہوں۔ آپ مجھے ہمالیہ کی چوٹی سے بحرالکاہل میں دھکا دیدیجئے انشاء اللہ شام ہی کو ہنستا کھیلتا آپ سے آملوں گا۔ آپ میرے سینے پر ہاتھیوں کی فوج کھڑی کر دیجئے میرے ہنسنے اور گانے کے معمول میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ یقین کیجئے ہجر کی پوری پوری راتیں میں نے سو کر گذاری ہیں۔ کیا مجال ہے عشق کے زہرہ گداز آلام نے میری صحت پر ذرا بھی بُرا اثر ڈالا ہو بلکہ ——— خدا معاف کرے تجربے سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ عشق جتنا جتنا دو آتشہ ہوتا جاتا ہے بھوک اتنی ہی اتنی کھلتی جاتی ہے اور کھانے کے بعد مُنہ میٹھا کئے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا۔

لیکن اس بار جو قیامت کبریٰ مجھ پر ٹوٹی ہے اُسکو جھیل جانے کی سکت میں اپنے اندر نہیں پا رہا ہوں۔ سکت پانے کا مطلب یہ ہے کہ کھوپڑی گندے انڈے کی طرح اُبل رہی ہے اور کہانی لکھنا تو درکنار صوفی بدرالدجیٰ کا نام تک یاد نہیں آرہا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک منحوس دن میں ایڈیٹر تجلّی بڑا خراب موڈ لئے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں غسل خانے میں تھا۔ وہ اپنی بہن سے کہنے لگے:۔

"نسیمہ! میں تو عاجز آگیا ہوں اس خبیث سے۔ اب تو آٹھ دن بھی ایسے نہیں گذرتے جن میں کوئی نہ کوئی شکایت لیکر نہ آتا ہو کہ مُلّا نے یہ کر دیا اور مُلّا نے وہ کر دیا۔"

میرا لوٹے والا ہاتھ سر کے قریب ہی رُک گیا۔ معاملہ بے ڈھب معلوم ہوتا تھا۔ ان کے خشک اور کھردرے لہجے سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ آج کوئی خطرناک ارادہ لیکر آئے ہیں "خبیث" کی ث کو انھوں نے تجویدی قاعدے کے بالکل خلاف حلق کی آخری تہہ سے نکالا تھا جو ان کے معاملے میں ہمیشہ اس بات کی علامت رہی ہے کہ کسی نہ کسی کو کچّا ضرور چبائیں گے۔ خیریت اسی میں نظر آئی کہ جبتک وہ ہیں غسل کو ملتوی کر کے صرف کان لگانے پر اکتفا کیا جائے۔

"تشریف رکھئے بھیّا" مُلّانی کی آواز آئی "میں چائے بناتی ہوں۔ سوجی کے شکرپارے بھی بنائے تھے وہ بھی چکھ لیجئے گا ———"

"بالکل نہیں۔ جب بھی کوئی شکایت لے کر آتا ہے

کم سے کم ایک وقت کی بھوک تو غارت ہو ہی جاتی ہے۔"

"لے ہے بھیا۔ آپ بھی کس کا اثر لیتے ہیں۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے۔"

"عادت کس چڑیا کا نام ہے۔" وہ غرائے "تم ہمیشہ اس کی حماقتوں کو معصومیت کا رنگ دینے کی کوشش کرتی ہو مجھے حیرت ہے تمھاری زبان سے کبھی اس کی شکایت میرے کانوں میں نہیں پڑی حالانکہ وہ تمھاری بھی ناک میں دم ضرور رکھتا ہوگا۔"

"نہیں نہیں بھیا۔ اللہ قسم وہ اتنے برے نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔" نسیمہ کی آواز میں بڑی شفقت تھی۔

"مت بکو" وہ دہاڑے "برائی کے کیا سینگ ہوتے ہیں۔ جس کا دیکھو دماغ چاٹ جائے گا۔ جسے دیکھو بیوقوف بنانے کی کوشش کرے گا ــــ چلو اس پر بھی صبر کر لو ــــ مگر مزاروں کی چادریں صاف کرا دینا اور مجاوروں وغیرہ کو طرح طرح سے تنگ کرنا شیطنت نہیں تو اور کیا ہے ــــ آج ہی سنو کیا ہوا ــــ صوفی قندیل صاحب آئے تھے۔ بتاتے تھے کہ ملا نے ان کی درگاہ کی کسی زائرہ کو بہکا سکھا کر ان سے بیزار کر دیا ہے۔ وہ چادریں بھی غائب ہیں۔ ایک پوسٹر اس مضمون کا شہر میں لگا ہوا ہے کہ پیر زلف دراز کا مزار فراڈ ہے۔ اس میں ایک شرابی دفن ہے جو شراب کے دھوکے میں ٹنکچر پی کر مر گیا تھا ــــ بتاؤ یہ باتیں قابل برداشت ہیں؟"

نسیمہ کی گھٹی گھٹی ہنسی بلند ہوئی مگر فوراً بریک بھی لگ گیا۔ غالباً بھائی صاحب نے لال پیلی نظروں سے گھورا ہوگا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں بھیا کہ وہ پوسٹر انھوں ہی نے لکھوایا ہے۔"

"مضمون سے۔ پیرائے سے۔ صوفی صاحب ایک پوسٹر بھی درگاہ کے دروازے سے چھڑا کے لائے تھے۔ اس کا لفظ لفظ منھ سے بول رہا ہے کہ یہ شریر ملّا کی تراوش ہے۔"

ایک لمحے خاموشی رہی۔ ملائن غالباً جواب سوچ رہی تھی۔ مجھے غریب ــ اسکی دبی دبی آواز آئی:۔

"خیر بھیا۔ جھوٹ تو وہ کبھی لکھ نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوگی ــــ"

"چرب زبانی مت دکھلاؤ ــــ سچ اور جھوٹ کا سوال نہیں، سچ تو یہ بھی ہے کہ تمھاری سہیلی زہرہ کی سسرال والے خالص ایرانی النسل ہیں مگر وہ اپنے آپ کو اصلی سید بتلاتے ہیں پھر کیا میں ان کی تشہیر میں اشتہار شائع کروں گا؟ ــــ تم باتیں بنائے جاؤ ہوگا ایک دن یہی کہ کوئی اسے جان سے مار دے گا۔ جان سے نہ سہی اتنا ضرور مارے گا کہ وہ اپنے پیروں سے گھر نہیں لوٹ سکے گا۔"

بہن پھر سوچ میں پڑ گئیں۔

"وہ ہے کہاں؟" دفعتاً بھائی صاحب نے سوال کیا۔

"جی ... جی ابھی تو یہیں تھے ... مگر بھیا قانون بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ کسی کو مار ڈالنا آسان تو نہیں ہے۔"

"زبان چلائے جاتی ہو ــــ قانون مُردوں میں جان نہیں ڈال سکتا ــــ بڑی آئیں قانون والی ــــ جاؤ تمہاری قسمت تھی وہ بچ گیا، ورنہ پچھلے ہی جمعے جنگل شاہ کی درگاہ کے سامنے اسے چار آدمیوں نے گھیر لیا تھا۔"

"ہائے اللہ ــــ مجھے تو انھوں نے نہیں بتایا۔"

"بتاتا کیا ــــ وہ ایسے خطرات کو اہمیت ہی نہیں دیتا ــــ حالانکہ یہ بہادری کی نہیں دیوانگی کی علامت ہے۔ کسی دن بات نکل آئی تو ضرور تمھیں مزے لے کر سنائے گا۔"

"تو کیا ہوا تھا؟" بہن نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"میرا سر ہوا تھا" بھائی صاحب جھلائے۔ "اب میں تمھیں کہانیاں سنایا کروں گا۔ خبطی ــــ احمق ــــ وہ دیکھ لینا یا تو پاگل ہو جائے گا یا جیل میں سڑ جائے گا۔"

"ج ... جیل میں" ملائن گھگھیائیں۔

"اور کیا جنت میں ــــ چار میں سے ایک کا سر پھاڑ دیا۔ ایک کے چار دانت توڑ دیئے۔ مردود نے نہ جانے کہاں سے باکسنگ بھی سیکھ لی ہے۔"

"اللہ توبہ ــــ کیا گھونسوں سے سر بھی پھٹ

جاتا ہے۔"

"استغفر اللہ۔ ارے کسی کو پکّی سڑک پر بیٹھ گئی تو کیا سر میں بال اُگ گئے۔۔۔ آخر۔۔۔ تم میں بھی اسکے اثرات کافی آگئے ہیں۔ بات میں بات نکالتی ہو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی ــــ ہولناک، پراسرار خاموشی ــ پھر بھائی صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:۔

"میں نے طے کرلیا ہے کہ اب اسے بھی باضابطہ پابندی سے دفتر آنا ہوگا۔ دن بھر ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے۔ اسی لئے اور بھی لغویات سوجھتی ہیں ـــ آجائے تو کہہ دینا فوراً مجھ سے ملے۔"

اور اس طرح ایک پیدائشی مردِ آزاد کے پیروں میں بیڑیاں ڈالدی گئیں۔ شاید اسی لئے شاعر نے کہا تھا:۔

بچپن ہی سے لکھی تھی مقدر میں اسیری
ماں باپ کہا کرتے تھے دلبندِ جگر بند

الغضہ لِلّٰہ۔ صبح سات سے بارہ تک، پھر دو سے پانچ تک پورے آٹھ گھنٹے کی ہوشربا ڈیوٹی۔ اس دوران میں صرف ایک نماز کا وقت آتا تھا۔ یعنی ظہر کا۔ عام حالات میں یہ نماز دس بارہ منٹ سے زیادہ نہیں لیتی، لیکن مصیبت میں خدا بڑی شدت سے یاد آتا ہے۔ چنانچہ سوا ایک پر اذان سنتے ہی میں دفتر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟" وہ ڈپٹ کر بولے۔

"آذان کے بعد سوائے مسجد کے کہاں جایا جاسکتا ہے"

میں نے نہایت عابدانہ انداز میں کہا۔

"یہ مغرب کی آذان نہیں ہے ـــ بیٹھ جاؤ ـــ"

میں ان کے لہجے کی گرج سے سہم کر بیٹھ تو گیا مگر اندر ہی اندر خون اَونٹ رہا تھا۔ اسے فرعونیت نہیں تو تاناشاہی ضرور کہیں گے کہ وہ عبادت کے معاملے میں بھی دخل انداز ہو رہے تھے ــ مجھے اچانک وہ عربی فقرہ یاد آیا جو کچھ روز پہلے انھی کے ایک مضمون میں پڑھا تھا میں مسکرایا:۔

"لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔"

یہ میری مسکراہٹ تھی کر ایک سکنڈ کے ہزارویں حصّے کے لئے مسکرائے پھر ہونٹ بھینچ کر کڑوی نظروں سے مجھے گھورا۔

"یہ سلسلہ روک کر کیوں بیٹھ گئے" انھوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"بات یہ ہے جناب۔ آذان کی پکار سننے کے بعد دل ودماغ کسی دنیاوی کام کے قابل نہیں رہ سکتے ـ سنتیں وغیرہ بھی تو پڑھنی ہیں ـ"

"وغیرہ تو جیسی تم پڑھتے ہو میں خوب جانتا ہوں ـــ میرا خیال ہے سنتیں بھی شاید تم نے عرصے سے نہ پڑھی ہوں ـــ"

میری کھوپڑی سے شعلہ سا اُٹھا ـــ یہ شعلہ اُس مسکراہٹ کا رہین منت تھا جو منشی شہید الزماں کے ہونٹوں پر نظر آرہی تھی۔ وہ دوسری میز پر بیٹھے قلم چلا رہے تھے اور مسکراتے ہوئے انھوں نے انکھیوں سے مولوی برہان الدین کی طرف بھی دیکھا تھا۔ مولوی برہان الدین ہونٹوں سے تو نہیں ہنس رہے تھے مگر ان کی ناک اس طرح سکڑی ہوئی تھی جیسے اُبلتے ہوئے تبسّم کو اندر ہی اندر گھونٹ رہے ہوں۔

خیر پہلے روز تو ڈھائی سے قبل مسجد جانے کی نوبت نہ آسکی، لیکن یہ نہایت روح فرسا تھا۔ روح فرسا یوں تھا کہ نماز سے قبل میں ہوٹل میں ایک پیالی چائے ضرور پینا چاہتا تھا۔ بارہ بجے دفتر سے اُٹھنے کے بعد ایک بجے تو کھانے ہی سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر قیلولے کے لئے کروٹیں بدلنے میں ڈیڑھ بج گیا اور پھر جو حقّے کے کش لیتے ہوئے اخبار کی دو چار سُرخیاں پڑھیں تو پونے دو ہوگئے۔ اخبار پڑھتے پڑھتے میٹھی نیند کے گھوارے میں پہنچ جانا میرا روز کا معمول تھا۔ آج بھی ہلکا ہلکا نشہ آنے لگا تھا مگر تھرا ایڈیٹر بجان ملّا ٹھیک پونے دو پر اُٹھ جانا پڑا کیونکہ ایڈیٹر صاحب کا فرمان یہ تھا کہ ڈیوٹی پر ہمیشہ پانچ منٹ پہلے پہنچو ـــ

..... منھ ڈیوٹی ـــــ لعنت ہے ایسی ڈیوٹی پر۔ نیند آنکھوں میں بھری ہوئی تھی سر بقول شاعر زانوئے یار پہ ہونے کی بجائے بارِ دوش محسوس ہو رہا تھا۔ ایک پیالی گرم چائے اس وقت وہی کام کرتی جو..... جو اسے کرنا چاہئے

آپ سمجھ رہے ہوں گے کیوں نہ سوا دو بجے ہی ہوٹل سے دفتر ہی میں چائے منگا کر زہر مار کی گئی۔ یہ کیا ضروری تھا کہ ہوٹل ہی میں جایا جاتا۔ تو سمجھ لیجئے آپ غلطی پر ہیں ـــ جمہوریت اور آزادی کہیں اور آتی ہو تو آتی ہو کم سے کم دفترِ تجلّی میں نہیں آتی۔ یہاں وہی ڈکٹیٹر شپ ہے جو انگریز کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مثلاً شام کی چائے کا وقت گرمیوں میں چار اور پانچ کے مابین مقرر ہے لیکن اوقات نماز کی طرح وہ موسم کی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ سڑی گرمی میں ٹھیک پانچ بجے کم گرمی میں چار بجے۔ درمیانی گرمی میں ساڑھے چار بجے جاڑوں میں تین بجے۔ سخت برفانی جاڑوں میں دو بجکر سولہ منٹ پر۔ اب کیا مجال ہے اوقات کے خلاف کوئی چائے کا تصور بھی کر سکے۔

اِن دنوں ساڑھے چار کا ٹائم تھا۔ اسٹاف میں سے کسی کی بھی مجال نہیں تھی کہ اس سے قبل چائے کا نام بھی لے سکے ـــ بتائیے مجھے آذان سُنکر خدا کیسے نہ یاد آتا!

جماعت میں کتنی رکعتیں ہوئیں یہ یاد نہیں ــ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ آج ظالم امام صاحب نے قیام بہت طویل اور سجدے بہت مختصر کئے تھے۔ حالتِ قیام میں ایک بار تو نیند نے میرے قدم اُکھاڑ ہی دیئے تھے بمشکل برابر والے صاحب کا سہارہ لیکر سنبھل تھا اور ان صاحب نے تاؤ میں آکر کہنی بھی رسید کر دی تھی۔ عام حالات میں مَیں ضرور فتویٰ دیتا کہ ان کی نماز فاسد ہو گئی لیکن فی الحال تو خود اپنی نماز کے بارے میں فتویٰ زیرِ غور تھا۔ کھڑے کھڑے سونا مفسدِ نماز ہے یا نہیں یہ مسئلہ بہشتی زیور تک میں نہیں ملا۔

سلام پھیرا گیا تو آخری دو سنتوں کا نمبر تھا۔ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی میں نے بھی نیت باندھی لیکن بجائے حمد و ثنا کے یہ سوال اُبھر کر سامنے آگیا کہ اگر نارمل ہی رفتار سے سنتیں پڑھی گئیں تو واپسی ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی ہو گی پھر ظاہر ہے ہوٹل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی جی میں آئی کہ بغیر سنتوں کے بھاگ چلوں لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ دیوبندی ہوٹلوں کی بھٹیاں گرمیوں کی دوپہر میں عموماً نیم مردہ ہی رہتی ہیں۔ جاتے ہی چائے میسر آنی محال تھی ـــ جب تک بھٹی گرم ہو کر چائے پینے کی نوبت آتی ایڈیٹر صاحب مسجد سے واپس آلیتے اور پھر دفتر میں مجھے نہ پاکر چپراسی ہی کے ذریعے طلبی ہوتی۔

بہتر یہی معلوم ہوا کہ پہلے ایڈیٹر صاحب کو رخصت ہو لینے دیا جائے۔ اس صورت میں وہ یہی گمان فرمالیں گے کہ شاید نوافل پڑھی جارہی ہیں۔

وہ سنتوں سے فارغ ہو کر مڑے تو میں ابھی پہلی ہی رکعت میں تھا۔ وہ ٹھٹکے۔ ٹھٹک کر دیوار کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ میں کنکھیوں سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار نظریں چار بھی ہو گئیں تو ان کی آنکھوں میں خون آشامی کی جھلک نظر آئی۔ میں سجدے میں گر گیا۔ تقریباً اکتالیس بار تسبیح پڑھ کر سر جو اُٹھایا تو وہ اب بھی اپنی جگہ موجود تھے دوسرے سجدے میں یہ تعداد میں نے اکتالیس سے آگے تک پہنچا دی لیکن وہ نہیں سرکے۔ اب تو دوسری رکعت کے قعدے میں مَیں یہ تہیہ کرکے بیٹھ گیا کہ جب تک وہ رخصت نہیں ہوں گے سلام نہیں پھیروں گا۔

آخرکار وہ چلے گئے اور میں تیر کی طرح مسجد سے نکلا' سُنا ہے تیر کمان سے نکل کر لوٹا نہیں کرتا مگر ان کے معاملے میں یہ مقولہ بھی غلط ثابت ہوا۔ وہ تو دیوار بن کر دروازے ہی پہ موجود تھے ـــ میں نے جھلک دیکھی تو اُلٹے پیروں لوٹ گیا۔

الحاصل چائے مل ہی گئی۔ ٹھیک ساڑھے تین بج رہے تھے جب میں گردن لٹکائے دفتر میں داخل ہوا ہوں۔ یقین تھا کہ آج نئی قسم کی شرعی گالیاں ضرور سُننے کو ملیں گی۔ مگر لیے لیسا آرزو کہ خاک... نہ توبہ

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے موقع کے لئے شاعر نے کہا تو ضرور ہے کوئی مصرع جو ذہن کے کسی دُور افتادہ گوشے میں کلبلا رہا ہے لیکن حافظے کی گرفت میں نہیں آرہا۔

انھوں نے صرف ایک غلط انداز سی نظر مجھ پر ڈالی اور اپنے کام میں لگ رہے۔ میرا خیال ہے یہ انھوں نے عقل مندی ہی کی ورنہ اشتاف کے سامنے صلواتیں سنکر میں شاید ان سے لڑ ہی جاتا۔ پھر دوسری عقل مندی یہ کی کہ شام کو غریب خانے پر تشریف لاکر پہلے تو دل کی بھڑاس نکالی پھر یہ رعایت دے ہی دی کہ جاؤ اور نماز روزوں سے فارغ ہو کر دفتر حاضر ہوا کرو۔

دفتر میں میرے سپرد فی الحال پتے لکھنے کا کام ہوا تھا۔ ویسے تو خریداروں کے پتے چھپے ہوئے رہتے ہیں لیکن چار پانچ سو پھر بھی ایسے باقی رہتے ہیں جن کے چھپنے کی نوبت فوری طور پر نہیں آتی۔ یہ کام میرے لئے سخت بورکن تھا۔ نقل را چہ عقل۔ گویا ایک گدھے میں اور ابن العرب میں کوئی فرق نہیں رہ گیا۔ میری تخلیقی صلاحیتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کبھی اپنے مسودے یا خط کی نقل کرنی پڑی ہے تو وہ بھی کبھی جوں کی توں نہیں ہو سکی۔ ایک زمانے میں، میں کاتب بھی تھا لیکن لوگوں نے مجھے کام دینا اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کا خیال تھا میں مسودوں میں حذف و اضافہ کرتا ہوں۔

آٹھ دن بڑی بیزار کن یکسانیت سے گذرے۔ بارے نویں دن کچھ فضا بدلی۔ میں ٹھیک ساڑھے تین بجے اپنی میز پر پہنچا ہی تھا کہ غراہٹ کی آواز سنائی دی:-

"اِدھر آؤ"

خدا خیر کرے۔ غراہٹ میں بڑی تندی تھی۔ میں پہنچا تو ایک لمبا سا خط ایڈیٹر صاحب نے میرے آگے بڑھا دیا اور اس کے ساتھ پتے کی ایک چِٹ بھی پن سے نتھی تھی:-

"اسے پڑھو"

میں نے تعمیل کی۔ خط کیا تھا انگاروں کی انگیٹھی تھی۔ لکھنے والے تجلّی کے خریدار ہی تھے۔ انھوں نے بہت کچھ کہی اَن کہی سناتے ہوئے لکھا تھا:-

. . . . "یہ حرکت آپ کے دفتر والوں کی یقینی طور پر دانستہ ہے۔ میرا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ مجھے آپ جیسے عالم دین سے ایسی امید نہیں تھی۔" وغیرہ وغیرہ

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا" میں نے بے تعلقانہ انداز میں کہا۔

"میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں گا ۔۔۔ پتے کی چِٹ پڑھو۔ یہ تمھاری ہی تو لکھی ہوئی ہے ۔۔۔"

"جی ہاں ۔ ۔ ۔ مگر اس میں کیا نقص ہے ؟" میں نے دل ہی دل میں پتا پڑھکر سوال کیا۔

"زور سے پڑھو ۔۔۔ منشی جی ۔۔۔ مولوی برہان صاحب اور میاں مرغوب حسین آپ لوگ بھی سنیئے گا۔ پڑھو"

میں نے زور سے پڑھا۔

"خمیرہ بانو بنت حکیم جوارش علی۔ محلّہ جمال گھوٹہ"

دفعتًا فضا دبی دبی ہنسی کی سرسراہٹوں سے لبرا اٹھی۔ منشی جی نے تو منھ پر رومال رکھ لیا تھا اور مولوی برہان ناک بھینچ رہے تھے جس کی وجہ سے قہقہہ ہچکی کا انداز اختیار کر گیا تھا۔ میاں مرغوب کھل کر ہنسنے والے تھے مگر انھی کی طرف ایڈیٹر صاحب نے قہر آلود نظروں سے گھورا تھا جسکے نتیجے میں قہقہے کو بریک لگ گئے تھے۔

"بتا تو ٹھیک ہے" میں نے کہا ۔۔۔ "یہ صاحب خفا کس بات پر ہو رہے ہیں ؟"

"اڑنے کی کوشش مت کرو ۔۔۔ یہ حرکتیں میں برداشت نہیں کروں گا"

"ارے صاحب بتائیے بھی تو کچھ ۔۔۔ پتے اور نسخے میں اگر فرق نہیں رہ گیا ہے تو اس کی ذمہ داری پتوں کے رجسٹر پر ہے۔ میں تو صرف ٹیپ ریکارڈ ہوں۔"

"منشی جی" وہ دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ "ذرا پتوں کے رجسٹر میں ۶۳۲۶ نمبر کا پتہ کھولئے"

منشی جی ہنسی ضبط کرنے کی خاطر نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبائے رجسٹر قریب لائے اور مذکورہ پتا کھول کر سامنے کر دیا۔

"پڑھو اس میں کیا درج ہے۔" ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے کہا بلند آواز سے پڑھو"

میں نے پڑھا ــــ "خمیرہ بانو۔۔۔"

"خ کا نقطہ کہاں ہے؟" انھوں نے کھلے ہوئے صفحے پر نظر ڈالتے ہوئے ڈپٹ کر پوچھا۔

"یہ رہا۔۔۔" میں نے نقطے پر انگلی رکھ دی۔

ان کے چہرے پر ہوائیاں سی چھوٹ گئیں۔ منھ کو صفحے کے قریب کرکے بغور معائنہ فرمایا پھر کرسی کی پشت سے ٹکتے ہوئے بولے:۔

"تمھیں اتنا بھی نظر نہیں آتا کہ یہ نیلی روشنائی کا نقطہ نہیں ہے بلکہ سیاہی مائل نشان ہے جو یقیناً مکھی ہی کی کارگزاری ہو سکتی ہے ــــ آخر تمھیں سوجھا تو تھا کہ خمیرہ بانو بھی کوئی نام ہوتا ہے"

"جناب نقل را چہ عقل کا قاعدہ میرا بنایا ہوا تو نہیں ہے۔ پھر والد صاحب کا نام حکیم جوارش علی ہے تو بیٹی کا نام خمیرہ بانو کیوں نہیں ہو سکتا؟ ــــ"

ان کے چہرے پر تبسم کی ایک گریزپا سی لہر آئی۔

"بکواس کئے جاؤگے ــــ یہ حکیم جوارش علی ہے؟"

میں نے جھک کر دیکھا۔۔۔ "ارر۔۔۔ اوہ۔۔۔۔

وہ مجھے مستفسرانہ نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔۔

۔۔۔ "ہوں کیا پڑھا؟"

"جی۔۔۔ جی یہاں واقعی مجھ سے چوک ہو گئی ہے۔۔۔ مگر آپ خود سوچئے جب متن ہی میں بیٹی صاحبہ کا نام خمیرہ بانو آ جائے تو حکیم نوازش علی کو جوارش علی پڑھ لینا ایک قدرتی سا فعل کہلائے گا۔۔۔ وہ جیسے۔۔۔۔

"خیر خیر ــــ آگے پڑھو ــــ"

"اب تو آگے بھی پڑھ لیا۔ جمال کوٹ اور جمال گھوٹہ کی مشابہت سے آپ انکار نہیں کر سکتے ــــ آخر حافظوں کو بھی تو مشابہہ لگتا ہے ــــ"

"بس چپکے اپنی جگہ بیٹھو۔ یہ پہلی شرارت معاف کرتا ہوں آئندہ معاف نہیں کیا جائے گا"

پھر انھوں نے منشی جی سے فرمایا "آپ منشی جی ان کے لکھے ہوئے پتے چیک کئے بغیر نہ جانے دیا کریں ــــ"

چوتھے روز پھر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا منشی جی نے عاجز کا لکھا ہوا ایک پتہ ایڈیٹر صاحب کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس طرح تھا۔

منشی باربردار علی عرف بابوجی۔ محلہ چھالی کتھ۔

اس میں بھی میرا قصور نہیں تھا۔ رجسٹر لکھنے والے کا خط ہی ایسا تھا کہ مشابہ لگے اور پڑ لگے۔ اس نے شکستہ انداز میں بردبار علی لکھا تھا مگر پڑھا وہ باربرداری جاتا تھا۔ میں ٹھٹکا بھی تھا کہ یہ کیا نام ہوا مگر خیال ہوا کہ لوگ کلب علی اور غلام علی بھی نام رکھتے ہیں تو اضافت کے ساتھ باربردار علی کیوں نہ رکھیں گے۔ باربرداری گدھوں اور خچروں کا کام ہے۔ گدھے اور خچر بھی کتّوں سے بہرحال زیادہ تقرب تسمجھے گئے ہیں۔

رہا بابوجی تو با کا نقطہ ہی لکھنے والے نے ایسا گھسیٹ دیا تھا کہ یا پڑھے بغیر چارہ نہ تھا اور توجیہہ یہ ذہن میں آئی کہ "باربرداری" ہی کے تعلق سے انکی عرفیت بابوجی پڑ گئی ہوگی۔ کسی منشی کو لوگ بابوجی کہنے سے رہے۔ محلہ کا قصہ یہ ایسا ہے کہ دنیا میں سب طرح کے محلے ہوتے ہیں۔ کٹ گیاں۔ بھاڑ۔ کوچہ بھوندوناتھ ــــ تو چھالی کتھ تو یقیناً ان سے بہتر ہی ہے۔ اصل میں لکھا گیا تھا "چھال کہنہ" ــــ ہوگی وہاں کوئی پرانی چھال۔ اب دیکھ لیجئے منشیانہ تحریر میں چھال کہنہ کو چھالی کتھ پڑھ لینا بڑی حد تک قرین قیاس ہی ہے۔

ایسے ہی متشابہات برابر سامنے آتے رہے۔ ایک مرتبہ ایک ڈاکخانہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے بہت غور کیا مگر ایک ہی لفظ بنتا نظر آیا۔ "ملوشام کوٹ" دماغ نے ابا بھی کیا کہ یہ کیسا نام ہو سکتا ہے۔ مگر فوراً ہی یہ بھی یاد آ گیا کہ اپنے قریب ہی ایک قصبہ "کھتولی" بھی تو ہے۔ "کھاتولی" ہی کی طرح "ملوشام کوٹ" بھی ایک فقرہ ہے۔ کیا بعید ہے نام پڑ ہی گیا ہو۔

بعد میں ثابت ہوا کہ یہ اصل میں میلسی تارم تھا۔

ایک مرتبہ غیاث الدین کو قیاس الدین لکھا پڑا کیونکہ غیبا رجسٹر میں ٹھیک قیا لکھا ہوا تھا۔ اب اتنا جاہل تو میں بھی نہیں ہوں کہ قیاس کو ث سے مان لیتا۔ سوچا لکھنے والے سے چوک ہوئی ہے اصلاح میرا فرض ہے۔

ایک مرتبہ پاکستان کا ایک پتہ انگریزی میں درج تھا۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ پاکستانی پتوں میں انگریزی کی ضرورت نہیں ہیں نے شہر کا نام اردو میں ماڑدن لکھا دیا۔ یہ فی الحقیقت مردان MARDAN تھا۔

ایک ہی ماہ میں اس طرح کے جوق در جوق کارناموں سے تنگ آکر ایڈیٹر صاحب نے میری ڈیوٹی بدل دی ——— ڈیوٹی کیا بدل دی کھڑے کھڑے گولی مار دی۔۔۔

(ملا زندہ صحبت باقی)

فتاوی دارالعلوم | "دارالعلوم" دیوبند کے مستند فتاوی جو ہر طرح کے مسائل میں آپکی دینی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ گھر میں رہے تو ضرورت کے وقت کسی بھی مسئلے کے متعلق شرعی حکم و ہدایت کا علم حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تازہ ایڈیشن عمدہ ترتیب اور اچھی طباعت کے ساتھ مکمل آٹھ حصوں کی قیمت اکیس ۲۱ روپے۔
مجلّد در دو جلد پچیس ۲۵ روپے

ہمارے پیغمبر | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا دلکش بیان اور خاص خاص دینی عقائد کی تفصیل و توضیح۔ قیمت سوا روپیہ۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ترین اور انقلاب آفریں زندگی پر ایک انوکھی کتاب۔ اتنی دلچسپ کہ آپ ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہ رکھ سکیں گے۔ مؤلف ہیں مصر کے توفیق الحکیم اور عمدہ اردو ترجمہ کیا ہے عطیہ افتخار اعظمی نے۔ صفحات ۲۲۰ پانچ روپے۔

انتخاب مکتوبات امام ربانیرح | حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اصلاحی لٹریچر میں لاجواب مانے گئے ہیں۔ علوم و معارف اور مواعظ و نصائح کا بیش بہا گنجینہ سلیس اردو ترجمہ کی شکل میں بہت سے خصوصی اہمیت کے حامل مکتوبات یکجا کئے گئے ہیں۔ ساڑھے ...

ردّ بدعت | حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات کی روشنی میں بدعتوں کا رد۔ سوا روپیہ۔

آداب زیارت قبور | شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب کا اردو ترجمہ۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ۳۷ پیسے۔

نصیحت نامہ | عالم ربانی مولانا بدر عالم کا نصیحت نامہ جو ہر مسلمان کے لئے بہترین ہدایات و نصائح پر مشتمل ہے۔ ۶۲ پیسے۔

مولانا محمد تقی امینی کی تین کتابیں

مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر | "اجتہاد" اسلام کی ایک معروف اصطلاح ہے لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک مفہوم، اس کے شرائط، اسکے حدود کیا ہیں اس کا علم عام لوگوں کو نہیں۔ اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ اجتہاد کی حقیقت اور تمام متعلقہ امور پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مجلّد تین روپے۔

مقالات امینی | اجتہاد، تدوین فقہ کی ضرورت اور فقہ کے اجتماعی مسائل پر مولانا امینی کے گراں قدر مقالات۔ دو روپے۔

کائنات میں انسان کا مقام | ایک علمی مقالہ جو کائنات میں انسان کے صحیح مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔ پچاس پیسے۔

سیرت حضرت عائشہ صدیقہؓ ---------- ۸۸ پیسے
سیرت حضرت بلالؓ ---------- ۶۵ پیسے
سیرت حضرت ابوایوب انصاریؓ ۶۲ پیسے
معلم نماز ---------- ۵۰ پیسے
خاصانِ خدا کی نماز ---------- ۷۵ پیسے
خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت ---------- ایک روپیہ

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

غفور میاں { ● معروف طنز نگار اور مزاح نویس تخلص بھوپالی کا تازہ شاہکار۔

● صفحات ۱۷۱ کاغذ سفید ● طباعت، کتابت دلپذیر۔
● قیمت مجلد دو روپے پچھتّر پیسے (جو مناسب سے کچھ زیادہ ہے)

"پاندان والی خالہ" کے ذریعے تخلص صاحب اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کا مخصوص طرزِ تحریر مزاج اور ہیئت کے اعتبار سے اگرچہ قدامت سے پیوند رکھتا ہے لیکن ان کی ذہانت اور تیکھے پن نے اسے جدّت کی چاشنی دے کر بڑا خوشگوار بنا دیا ہے۔

غفور میاں کون ہیں ؟

اس کا جواب مصنف نے آغازِ کتاب میں خود ہی مفصلاً دیا ہے
ہم سے پوچھئے تو غفور میاں ہمارے ماضی مرحوم کے کھنڈر کی ایک ایسی دیوار ہیں جس کی بنیاد تو کبھی کی کھوکھلی ہو چکی لیکن وہ ابھی تک پاس پڑے ہوئے ملبے کے سہارے کھڑی ہے۔
جھکّی، خیال پرست اور یاوہ گو — یہ ہیں غفور میاں

ان کے بغلی کردار بقّالی اور شبراتی بھی کم دلچسپ نہیں۔ یہ مثلث ہنساتی تو ہے ہی۔ رُلا بھی سکتی ہے بشرطیکہ اس کے سیرت و کردار کے غرفے سے ہماری نظر تاریخ کے اس گورستان تک پہنچ سکے جہاں اسلامی قدروں کے مزاروں پر بڑی شاندار الواح نصب کی گئی ہیں۔

غفور میاں جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں مصنف کو اس کی زبان اور فکری زاویوں پر بڑا عبور حاصل ہے تیکھا طنز، محاوراتی زبان۔ نرم و سبک مزاح۔ کتاب کے پہلے ہی صفحے پر نظر پڑتی ہے تو طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔ یہ صفحہ ہے انتساب کا۔ انتساب بڑی پرانی رسم ہے۔ اس رسم کی کہنگی سے کوئی نیا زاویہ نکالنا بڑی ذہانت کا طالب ہے اور اس ذہانت کا ثبوت مصنف نے بھرپور دیا ہے۔ ایک بیل گاڑی کے دونوں بیل گاڑی میں سوار ہیں اور بیلوں کی جگہ دو آدمی جوے میں جتے ہوئے ہیں۔ اوپر لکھا ہے:۔

انتساب — "اس بیل جوڑی" کے نام —!

کارٹون تو کارٹونسٹ ہی نے بنایا ہوگا مگر تخیل ظاہر ہے مصنف ہی کا رہا ہوگا۔ اصل قیمت تخیل ہی کی ہے۔ ذرا سی خامی کارٹونسٹ کی فنکاری میں رہ گئی۔ گاڑی میں جتے ہوئے آدمی چاق چوبند، باحوصلہ، طرار اور مگن نظر آ رہے ہیں حالانکہ انھیں بددل، دل شکستہ، شسست اور خستہ حال نظر آنا چاہیئے تھا۔

کتاب کا ایک ایک باب دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ غفور میاں نے بکرا خریدا۔ غفور میاں نے روزہ رکھا۔ غفور میاں نے مہر ٹھیرایا — غفور میاں نے پتہ بتایا — اسی طرح غفور میاں کے لیل و نہار کی مختلف جھلکیاں پوری کتاب میں بکھری ہوئی ہیں۔

اعتراض یہ ہے کہ نہ جانے کیوں مصنف کو مکالموں پر کوامے (واوین) لگانے سے چڑھ ہے۔ "پاندان والی خالہ" میں بھی یہی بات تھی اور اس کتاب میں بھی یہی بات ہے کہ کرداروں کی گفتگو اور مصنف کے بیانیہ فقرے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مصنف ایک اچھے تحریری ضابطے سے متنفر کیوں ہیں۔ کئی جگہ پیروں کی تبدیلی بھی غیر فنی نظر آئی۔ لفظ "کسرت" ایک سے زائد جگہ ث سے لکھا گیا ہے۔ قمیص کی صاد پر ایک جگہ نقطہ نظر آیا، یہ کتابت کا نقص ہوگا۔ (ع۔ ع)

مریض متوجہ ہوں { ناسمجھی، خراب ماحول اور غلط سوسائٹی کے سبب

راہ راست سے بھٹک کر اگر تم نے اپنی صحت کا ستیاناس کر لیا ہے اور ایسے امراض کے چنگل میں پھنس گئے ہو جو تم کو روز بروز کمزور اور ناتواں بنا رہے ہیں تو محافظ شباب مفت منگا کر پڑھو۔ اس کا مطالعہ بتائے گا کہ بگڑی تندرستی کیسے سنواری جا سکتی ہے اور آسان اور کامیاب طریقۂ علاج کیا ہے۔

حکیم محمد عظیم زبیری۔ امروہہ ضلع مرادآباد

مستقل عنوان

کھرے کھوٹے

حکایاتِ جنوں مؤلفہ :- اسعد گیلانی ● ناول سائز ● صفحات ۱۲۲ خوبصورت دبیز سرورق ● قیمت دو روپے ● شائع کردہ :- ادارہ ادب اسلامی۔ سرگودھا۔ مغربی پاکستان۔

جیساکہ خود مصنف نے "حرفِ اول" میں کہا ہے، یہ ہلکے پھلکے افسانے زندگی کے ان خاص واقعات پر مشتمل ہیں جن میں خاص خاص مواقع پر حالات و واقعات آدمی کے سوئے ہوئے شعور کو مقصدِ حیات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ افسانے مقصدی افسانے ہیں جن میں حقیقت کو کہانی کے روپ میں ڈھالا گیا ہے تاکہ یہاں سے آدمی کے قلب و نظر کی راہ سے ان کا تعمیری اثر ایکبار حقائق کی ٹھوس دنیا میں واپس آسکے۔

— کتاب کا پورا نام ہے "حکایاتِ جنوں اور دیگر افسانے" لیکن حکایاتِ جنوں عنوان کا کوئی افسانہ اس کتاب میں نہیں ہے۔ بہرحال پندرہ کہانیوں کے اس مختصر مجموعے میں فن اور تیکنک کے زاویے سے خواہ کتنی ہی تنقید کیوں نہ کی جائے مگر مواد اور جذبات کے لحاظ سے ان کو پڑھ کر ہر وہ دل اچھا اثر لینے پر مجبور ہوگا جس کو سلیقہ سے دھڑکنے کی تھوڑی سی بھی توفیق حاصل ہو۔

"یہ سکے" — "پردہ" — "ملاقہ نوری" اور "منزل ہے کہاں میری" خصوصیت کے ساتھ اس قلبی سوز، شعوری کسک، ذہنی تموّج اور مشاہدے کی گہرائی سے مالامال ہیں جس کا پرتو مجموعی طور پر ہر ایک کہانی میں دکھائی دیتا ہے۔ ہاں کہیں کہیں فن اور تیکنک کے نفسیاتی اصولوں سے بے نیازی "دلچسپی" پر حملہ آور ہو جاتی ہے — مثلاً "منزل ہے کہاں میری" میں طویل طویل مکالمے — ایک شخص ہے کہ مسلسل اور بہت دیر تک بولے چلا جا رہا ہے — یا "لال کوٹھی" میں غیر ضروری تفصیلات کی اکتانے والی درازی جہاں کوٹھی کی تعمیر کے سلسلے میں عمارتی اجزا، تخمینہ فیصدی رقم اور ذریعۂ فراہمی کا باقاعدہ چارٹ ہی دیدیا گیا ہے — یا کہیں کہیں نامانوس الفاظ کا استعمال جیسے "اپنے ہی گاؤں میں" نامی کہانی میں غالباً بے مقصدیت کی جگہ "بے وجہی" کا قطعی اجنبی لفظ نظر سے گذرا — اس انداز کے چند قابل نظرثانی گوشوں کے علاوہ یہ کتاب شروع سے آخر تک صرف ایک ہی تأثر دیتی ہے اور دیتی چلی جاتی ہے اور وہ یہ کہ —

"انسان کی انسانیت اس کا بہترین سرمایہ ہے اور انسانیت کی ساری آبرو خدا کی بندگی کے دم سے ہے۔"

مختلف واقعات کی سمتوں سے — مختلف تأثرات کے گوشوں سے یہی حیات انگیز تأثر پڑھنے والے کے دل و دماغ میں داخل کرنے کے لئے مصنف نے جو دردمندانہ کاوش کی ہے اس کا بہترین صلہ اس کتاب سے ذہنی اور عملی استفادہ ہے اور حق کوشی مصنف کے لئے دعائے خیر — اسعد گیلانی کے جواں قلب میں "جواں صالح" کی کیسی پاکیزہ جذباتیت اور اور کتنا تزکیہ آفریں درد پایا جاتا ہے! — خدا اس درد کو عام کرے اور اس کو ملتِ مرحومہ کے لئے بہترین درماں

ثابت کرے۔ (شمس نوید)

پکار • از:- اسعد گیلانی • ناول سائز۔ • صفحات ۱۴۴ ۔ خوبصورت دبیز سرورق • قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے • شائع کردہ- ادارہ ادب اسلامی۔ سرگودھا۔ (مغربی پاکستان)

بقول مصنف یہ مضامین "تحریکی ادب" سے تعلق رکھتے ہیں۔ موصوف کے ایسے ہی مضامین کے دو مبارک مجموعے "تصویریں" اور "انتظار" پہلے ہی دکھتے ہوئے دلوں کی دنیا میں حق کوشی کا اضطراب پیدا کر چکے ہیں۔ اب یہ تیسرا مجموعہ سامنے آیا ہے اور سابقہ دونوں مجموعوں سے بلند تر ہے۔

یہ کتاب "حرف اول" کے علاوہ سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔ یوں تو ہر مضمون قابل مطالعہ اور لائق صد استفادہ ہے۔ لیکن "لاشوں کے انبار" — "راکھ کے ڈھیر" — "پکار" — "فریاد" — "مولوی اور مسلمانی" — "جیل کے نام" اور "میرا دل چاہتا ہے" اس قدر پُرسوز اور فکر انگیز ہیں کہ ان کے مطالعے سے محروم رہنے والوں کی محرومی پر ترس آنا چاہئے۔ ان مضامین میں جذبۂ فکر نے کیسی کیسی بجلیاں کوندی ہیں اس کا ہلکا سا اندازہ حسب ذیل اقتباسات سے کیجئے:-

"اے لوگو یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ خدا کے باغی تمھارے کندھوں پر سوار ہیں اور تمھارے سینوں میں ایک ٹیس بھی پیدا نہیں ہوتی! — کیا تم یونہی لاشوں کی طرح تڑپتے رہو گے یہاں تک کہ ابلیس تمھیں اٹھا کر اپنے ٹرک میں ڈال لے اللہ کے بندو تم تو بالکل ہی لاشوں کے انبار بن کر رہ گئے ہو" (لاشوں کے انبار)

...."جو اٹھتے ہوئے باطل کے سیل کو دیکھ کر [illegible] کے تنگ گوشوں میں چھپ جانا چاہتے ہیں اور اپنی عافیت گاہوں کی کھڑکیاں اور دروازوں پر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کی تاویلوں کے دبیز پردے ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ باطل کی قوت و شوکت سے ذلیل مصالحت جن کی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہی ہے — آہ! کوئی انھیں جگائے اور بتائے کہ تم اپنے خدا کو کیسے دھوکا دے سکتے ہو" (راکھ کے ڈھیر)

— "کیا یہ وہی وقت ہے جب تیرا نام لینا مٹھی میں انگارہ پکڑنے کے مانند ہو جانے والا تھا؟ اگر یہ وہی وقت ہے تو مجھے ان انگاروں میں دفن کردے اس لئے کہ یہ وہی آگ ہے جو ابراہیم کیلئے بھڑکائی گئی تھی۔"

"....اگر اس دور میں تیری مشیت کی سنت یہ ہے کہ اسے جسموں کو تیریں تو یہ جسم تیری راہ میں بچھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ اشارہ ہے کہ لوہے کی کنگھیاں اپنا فرض ادا کریں تو یہ تیرا ہی مال ہے.... لیکن تو بہتر جانتا ہے اور تجھ سے بڑھ کر کس میں جاننے کی ہمت ہے کہ یہ مٹھی بھر انسان صرف تیرے ہی نام کا مینار تعمیر کر رہے ہیں اور تیری ہی اذان حق بلند کرنا چاہتے ہیں اور تجھے ہی منانے کے لئے سارے جہان سے روٹھے ہوئے ہیں اور تیری ہی چشم التفات کا ایک گوشہ ان کے لئے سہارا زندگی ہے۔ تو انھیں برباد نہ ہونے دے۔ ان کی دستگیری فرما۔" (فریاد)

"ایک دار سے کام نہ چلے گا۔ نہ ایک جیل سے نہ ایک فوج سے۔ نہ ایک زندگی سے۔ تم اے باطل کے محافظو! تاریخ کے سینے پر کتنی بار دار و رسن لیکر ابھرو گے۔ کتنی جیلیں تعمیر کروگے کتنی فوجیں لے کر آؤ گے۔ کتنی بار مسمار ہو ہو کر مرو گے۔ حق کا سپاہی بار بار ہر دور میں آئے گا اور تمھاری کمر پر شدید ضربیں لگائے گا۔

حق تو زندہ و جاوید قوت کا نام ہے" (جبل کا نام)

اور آج —— یہ قلم اور کاغذ نہیں زندگی کا مجاہد' حق کا سپاہی" اسعد گیلانی" سچ مچ پاکستان کے کسی جیل خانے کی سنگدل دیواروں اور آہنی سلاخوں کو عملاً یہی پیغام جوش خروش سنا رہا ہے۔

کتاب کی اس قدر عظمت و تقدیس کے بعد اس کے جزوی قابلِ تنقید گوشوں کو میں نہ چھیڑتا — مگر کیا کروں کہ یہ فرض منصبی ہے۔ کچھ مقامات پر مصنف موصوف بعض نامانوس اور نادرست الفاظ کا استعمال کر گئے ہیں مثلاً:۔

۱:۔ خُدی کو ہائے ہوز سے لکھا ہے۔ (صفحہ حرف دل)

۲:۔ "ہم نے کفر اور جاہلیت کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں" (صفحہ ۱۰) "ڈگیں ڈالنا" ہم نہیں سمجھ سکے!

۳:۔ "جنجوں نے خدا کی رضا کے سامنے اپنی سپر ڈال دی ہے" (صفحہ ۱۵) رضائے الٰہی کے سامنے سپر ڈالنا ذوقِ لطیف پر اس لئے بار ہے کہ "سپر" ڈالنا شکست قبول کرنے کیلئے آتا ہے۔ حالانکہ خود کو رضائے الٰہی کے حوالے کر دینا سراسر فتح و کامرانی ہے۔

۴:۔ "جنجوں کے داروغے" (صفحہ ۴۳) ایسی جگہ داروغہ کی جمع نہیں آتی۔ خود "داروغہ" ہی استعمال ہوتا ہے۔

کاش اسعد گیلانی صاحب اپنے پاکیزہ جذبات کی قابلِ رشک رو میں زبان و ادب کے ان پہلوؤں پر بھی آئندہ نظر خاص رکھ سکیں۔ ایک بار پھر ہم اس کتاب اور اس کے قلمکار کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ (ش۔ ن)

جہانِ مومنان مشک فام (افریقہ میں اسلام)

- از:۔ احمد عبداللہ المسدو
- ناول سائز۔
- صفحات ۱۳۸

خوبصورت دبیز سرورق • قیمت دو روپے۔

• شائع کردہ:۔ المرکز الاسلامی۔ عالمی جمعیت تبلیغ اسلام

آغاز کتاب میں افریقہ کا ایک خوبصورت نقشہ دیا گیا ہے جس میں مختلف مذاہب کی آبادی کو علاحدہ علاحدہ دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد پہلے باب میں افریقہ کے مسلم علاقوں اور ان کی آبادی پر مفصل معلومات جمع کی گئیں اور کوئی شک نہیں کہ اس سلسلے میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ افریقہ کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب دکھانے کے لئے جو چارٹ کئی صفحات پر پھیلا ہوا ہے وہ بڑا قیمتی ہے۔ اس چارٹ کی روشنی میں یہ حقیقت جاں نواز سامنے آتی ہے کہ پورے برِّ اعظم افریقہ میں ساٹھ فیصد مسلمان ہیں۔

باب دوئم میں ماضی کی ان تمام تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے نتیجے میں افریقہ کے مسلمانوں کی اتنی بڑی اکثریت نے جنم لیا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ میں تبلیغ اسلام کا مجاہدانہ کارنامہ صوفیانہ سلسلوں کے ذریعہ عمل میں آیا ہے ایسے ۱۴ سلسلے الگ الگ گنائے گئے ہیں اور ان کا سرسری سا تعارف کرایا گیا ہے۔

اس باب کے حصہ ب میں انفرادی تبلیغی مساعی اور ان کے اصول و منہاج کا تذکرہ ہے — اور بتایا گیا ہے کہ اسلام کی جن خصوصیات نے تبلیغ اسلام کو کامیابی کی راہ پر لگایا ان میں اخوت و مساوات' ازدواجی ارتباط جبری' تعلیمات کی سادگی نسلی عدم امتیاز اور حج کے ساتھ تعدد ازدواج بھی شامل ہے — کیونکہ اس گرم علاقہ کے لوگ تعدد ازدواج کی سخت ضرورت محسوس کرتے تھے۔ عیسائیت اس سے روکتی تھی اور اسلام اس فطری مخصوص تقاضے کو بھی پورا کرتا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ افریقہ میں بزرگوں کی کرامات اور ان کے عرسوں کے ذریعہ بھی اسلام پھیلا ہے۔

آخری باب میں افریقہ میں تبلیغ اسلام کے مستقبل سے بحث کی گئی ہے اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ افریقہ میں اسلامی تبلیغ کی راہ میں سب سے بڑا مسئلہ وہاں کا سیاسی بحران ہے ۱۲ نکات پر مشتمل تبلیغ کا ایک منصوبہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس ادارے کا تھوڑا سا تعارف کرا دینا مناسب ہوگا جس نے اس کو شائع کیا ہے ادارے نے خود اپنا تعارف حسب ذیل الفاظ میں کرایا ہے:۔

"عالمی جمعیت تبلیغ اسلام جو دورِ حاضر کے تبلیغی اسلوب پر اور صوفیائے کرام کے تبلیغی موقف کے اعتبار سے

(اپنی صفحہ ہستی ابجا جعدی کی پہلی اردو احد بین الاقوامی تبلیغی انجمن ہے ۔ تو دہ جس تبلیغی تحریک کی حامل ہے اس کی حقیقی تنظیمی ابتداء تو غوث الاعظم محی الدین سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کے مبارک ہاتھوں آج سے تقریباً نو صدی قبل ہوئی مگر دورِ حاضر میں اس کے محرک سیّاح عالم مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم الصدیقی القادری نوراللہ مرقدہٗ ہیں ۔" (صفحہ ۱۰)

• اس کی ایک ملحقہ انجمن ڈربن کے شہر سے مشہور اسلامی انگریزی ماہنامہ مسلم ڈائجسٹ چودہ سال سے شائع کر رہی ہے اور دوسری ملحقہ انجمن نے کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) سے انگریزی اور افریقی زبانوں میں دینی کتابیں ایک لاکھ سے زائد تعداد میں ابتک پورے برّاعظم میں مفت تقسیم کی ہیں ... "

ان سطور سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ المرکز الاسلامی کراچی کا "تصوّف" اس عام خانقاہی بدنام تصوف سے بہت مختلف ہے جس کے ماننے والے کونے میں بیٹھ بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کو سب سے بڑا جہاد سمجھتے ہیں خواہ خانقاہ کے باہر اسلام پر کفر و باطل کے جتھے خونریز حملے کرنے میں مصروف ہوں ۔ عالمی جمعیت تبلیغ اسلام کو یہ فکر ہے کہ وہ خدا کے بندوں تک اس نعمت کو پہنچائے جو خدا نے خود انہیں عطا فرمائی ہے اور اس طرح عظیم ترین امانت میں خیانت کی مرتکب نہ ہو ۔

اس ادارے کے نظریۂ تصوّف کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ طریقت کو شریعت کی آئینی روشنی میں چلتا ہوا دیکھنا پسند کرتی ہے ۔ چنانچہ افریقہ کے صوفیانہ سلاسل کی تعریف میں یہ بات کہی گئی ہے کہ :-

" ... ان سلاسل تصوف کا طریقۂ تبلیغ قرآن پاک کے احکام اور رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں اپنے عہد کے حالات اور اپنے ماحول کے مقتضیات کو سامنے رکھ کر اجتہادانہ ... کیا گیا تھا ۔" (صفحہ ۲۹)

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کتاب و سنت کو "اصل چراغِ راہ" تسلیم کرنے کے باوجود افریقہ کے ان صوفیانہ سلاسل کی ان خصوصیات پر بھی تنقید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی جو کتاب و سنت اور اسوۂ رسول و اصحابِ رسول کے لحاظ سے "محلِ نظر" ہیں ۔ جیسا کہ یہ کتاب بتاتی ہے افریقہ کے ان تمام صوفیانہ سلسلوں کی بنیاد "ظہورِ مہدی" کے عقیدے پر رکھی گئی ہے ـــ ایک کے بعد دوسرے سلسلے کے سربراہ نے دعویٔ مہدویت کیا اور اس دعوی کو بنیادی عقیدے کی شکل دے کر کام کیا ـــ مگر اس کتاب کے مصنف نے اس "عقیدے" پر کوئی شرعی گفتگو اور آئینی جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ وہ خود کہتے ہیں کہ :-

"مہدویت کے عقیدے کی اسلامی اصل کے بارے میں صحیح رائے وہی ہے جو ایک مصری عالم نے ظاہر کی ہے کہ اس کا انکار و اثبات دونوں دلیل و برہان کے تابع ہے ۔"

ایک ایسا عقیدہ جو شریعت کی رو سے انکار و اثبات دونوں کے لئے دلیل و برہان کی گنجائش رکھتا ہو اور آپ اسکو جانتے بھی ہوں اور پھر بھی اس عقیدے کے مالہ و ما علیہ پر گفتگو نہ کی جائے تو یہ کونسی معقول چشم پوشی قرار پاسکتی ہے؟ اس سے تو تصوف کے سلسلے میں جانبداری اور عصبیت کی بو آتی ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ آپ تصوف کے نام پر ہر اسلامی اور غیر اسلامی شئے کو قبول کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں ۔ ایک ادارہ جو دنیا میں "تصوف" نہیں اسلام کو پھیلانے کیلئے اٹھا ہو اس کی طرف سے اس انداز کا شبہ بھی سخت اذیت دہ اور مایوس کن محسوس ہوتا ہے ۔

صوفیانہ سلسلوں کو مسلمانوں کے تاریخی سیاسی انحطاط و اختلال کا علاج ثابت کرتے ہوئے مصنف موصوف عیسائیوں اور تاتاریوں کے فتنوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے مسلک و مشرب کے مفاد میں جن جن بزرگوں کا تذکرہ مفید سمجھتے ہیں ان کا تذکرہ بھی کرتے ہیں مگر امام ابن تیمیہؒ کا نام نہیں لیتے ـــ کیا اس لئے کہ انھوں نے تصوف کے اسلامی اور غیر اسلامی اجزاء کو چھانٹنے کی کوشش کی تھی؟

ایک طرف آپ یہ لکھتے ہیں کہ:-

"افریقی تصوف بڑی حد تک حریمین اور طریق قادریہ کا روحانی پرتو ہے۔" (صفحہ ۲۲)

دوسری طرف یہ بتاتے ہیں کہ افریقی تصوف کے سلسلے مہدویت کے دعوے پر اپنی بنیاد اٹھاتے ہیں حالانکہ سلسلۂ قادریہ کی بنیاد اس عقیدے پر نہیں۔ یہ ایک متضاد موقف ہو گیا ہے۔ تیسری طرف صفحہ ۲۴ پر شاذلیہ کا تعارف کراتے ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ تیرھویں صدی کے نصف اول ہی میں اسی سلسلے نے سب سے پہلے روایاتی تصوف کو شمالی افریقہ میں داخل کیا۔ حالانکہ سلسلہ قادریہ کا تعلق چھٹی صدی سے ہے۔ اس کے علاوہ جب روایاتی تصوف تیرھویں صدی عیسوی میں شمالی افریقہ میں پہنچا تو اس سے پہلے سلسلوں کی تبلیغی اور مجاہدانہ خدمات کو "روایاتی تصوف" سے کیسے منسوب کر دیا گیا ہے؟ کیا یہ دوسرا تضاد نہیں؟ درحقیقت جن صوفیانہ سلسلوں نے تبلیغ و جہاد کی راہ سے افریقہ میں اسلام کو پھیلایا ان میں دعویٰ مہدویت کی سیاسی نوع کی چنگاری کو ان کارناموں میں خاص دخل تھا۔ دعویٰ مہدویت کی شرعی اصل سے بحث کرنے کو موقوف رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دعوے میں امامت اور سیاسی قیادت کا کچھ نہ کچھ وہی عنصر محسوس ہوتا ہے جس نے مسلمانوں کو "الحکم لِلّٰہ، الملک لِلّٰہ" کی لگن بخشی تھی۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ افریقہ میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں صوفیائے کرام کی حقیقی خدمات کا وزن محسوس نہ کیا جائے۔ منشا صرف یہ ہے کہ افریقہ میں جن جن اسلامی عناصر کی برکت سے اسلام پھیلا وہ سب ہی پیش نظر رکھنا چاہئیں۔ افریقی صوفیانہ سلاسل کے اس تذکرے کو غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جہاں مجاہدانہ جرات اور تبلیغی جوش اور تزکیۂ باطن کی فعّال تاثیر پائی جاتی تھی وہاں کچھ نہ کچھ ایسے تیور بھی نظر آتے ہیں جن کی نظیر قرونِ اولیٰ میں نہیں ملتی۔ ایک بہت موٹی سی مثال اس کی یہ ہے کہ مرابطین یا ملثمین کے سلسلے میں اس مسلک کے علمبردار "اپنے چہرے پر ڈھاٹے باندھے ہوئے ہوتے تھے اور اسی مناسبت سے بعض مغربی مصنفین نے ان کو "نقاب پوش" کا لقب دیا ہے۔" (صفحہ ۵۰) غور فرمائیے کہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے اسوے میں اس "یونیفارم" کی کونسی نظیر ملتی ہے؟ ــــ بظاہر یہ اختلاف محض چند گرہ کپڑے کا ایک اختلاف معلوم ہوتا ہے مگر لباس اور ظاہری ہیئت کوئی بے تہہ چیز نہیں۔ اس کے ڈانڈے آدمی کی مکمل اندرونی شخصیت سے جا کر ملتے ہیں۔

فکر و نظر کو جھنجوڑ کر رکھنے والا ایک خاص گوشہ یہ بھی تھا کہ آخر جس براعظم میں صرف یہ سلاسل کے ذریعہ اسقدر اسلام کی اشاعت ہوئی کہ پورے براعظم میں مسلمان ساٹھ فیصد کی بلندیوں تک جا پہنچے۔ وہ مسلمان اس وقت آخری پستی میں کیوں جا گرے جب مغرب کی طرف کی طرح سیاسی قوتوں نے یورش کی؟ ــــ کیا اسکی وجہ یہ تو نہیں کہ جن صوفیانہ سلاسل کے ذریعہ اس مسلم آبادی کو اسلام پہنچا تھا وہ ان مسلموں میں اسلام کا سیاسی شعور پوری طرح پیدا نہ کر سکے ہوں۔

ان تمام گزارشات کا ماحصل یہ ہے کہ عالمی جمعیت اسلام جس کا بارِ گراں کی ذمہ داریاں اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے اطرافِ عالم میں کام کرنا چاہتی ہے اس کو سوچنا چاہئیے کہ وہ عقیدت کی سادہ لوحی میں اگر اسلام کے ساتھ ساتھ کچھ غیر اسلامی اجزاء کی عالمی اشاعت تو نہیں کر رہی؟ ــــ خاص طور سے تصوف کے باب میں اس انجمن کو ژرف نگاہی سے کام لیکر اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا ہی چاہئیے۔ اس لئے کہ تصوف کے ماننے والے بھی اس حقیقت ــــ تاریخی حقیقت کو بہرحال ماننے پر مجبور ہیں کہ مسلمانوں کے ہر تصوف کو اسلامی تصوف نہیں کہا جا سکتا اور یہ کہ تصوف کی راہ سے غیر اسلامی تصوف و اشراقیت نے بھی بار بار اسلامی تعلیمات میں نقب مارنے کی کوششیں کی ہیں جس طرح صوفیائے کرام نے روحانیت کے

خاص دور کے مخصوص تقاضوں کو سمجھ کر ان کا مقابلہ اور اسلام کا دفاع کیا تھا اسی طرح آج کے مادی اور سیاسی دور میں مادی اور سیاسی فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں اسلام کے سیاسی تصور سے کمک حاصل کرنی ہی چاہیئے اور اسکو شجر ممنوعہ نہ سمجھنا چاہیئے جس طرح معیاری اسلامی تصوف میں ہمیں تزکیۂ باطن کے اکثر اجزا مل جاتے ہیں اسی طرح اسلام کا سیاسی تصور ہمارے اندر خدا کی حاکمیت کو خدا کی زمین پر ضیا پاش دیکھنے کی غیرت اور لگن پیدا کرتا ہے۔

آخر میں اس کتاب کے بعض الفاظ و اظہارات پر اظہار خیال کرنا ضروری ہے :-

(۱) صفحہ ۶ پر "جذبات بغاوت میں مبتلا ہوگئے" ٹھیک نہیں "مبتلا ہوگئے کے بجائے گرفتار ہوگئے" ہونا چاہیئے۔

(۲) صفحہ ۴۲ پر "اہم اور قابل نوٹ" کے بجائے "اہم اور قابل غور" ہونا چاہیئے۔ انگریزی لفظ کے ساتھ اضافت درست نہیں۔

(۳) صفحہ ۴۵ پر۔۔۔ "چشمۂ صافی سے پھوٹ بہا ہے" — "پھوٹ بہا" نہیں "پھوٹ نکلا ہے" ہونا چاہیئے۔

(۴) "۔۔۔ سب سے قوی ذریعہ مکہ کا حج ہے جس کو ہر ایک آزاد مسلمان زندگی میں ایک مرتبہ ادا کرنے پر محکوم ہے۔" یہاں "محکوم" لفظاً اور معناً دونوں لحاظ سے غلط ہے۔ لفظی طور سے تو یہاں "مامور" کا محل ہے اور معنی کے لحاظ سے یہ غلطی ہے کہ ہر آزاد مسلمان پر حج فرض نہیں — فرضیت حج کے لئے مالی استطاعت بنیادی شرط ہے" (ع - ج)

ماہنامہ لالہ زار۔ لکھنؤ ڈائجسٹ • مرتبہ :- افتخار اعظمی / عبد الحفیظ صدیقی

• صفحات • قیمت فی کاپی پچاس نئے پیسے • سالانہ قیمت پانچ روپے • ملنے کا پتہ :- ماہنامہ لالہ زار۔ سعادت گنج لکھنؤ نمبر ۳۔

زیرنظر شمارہ جنوری وفروری ۱۹۶۲ء کا مشترکہ شمارہ ہے۔ مضامین نظم ونثر کو جن عنوانات اور کالموں میں تقسیم کیا گیا ہے وہ عنوان کے لحاظ سے جاذب توجہ ہیں مثلاً "شخصی جائزے" جن میں آئین سٹائین کا تعارف کرایا گیا ہے اور بڑے تعمیری زاویئے سے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس یہودی نے کس طرح الحادکیش سائنس کا دھارا خدا کی ہستی کے اعتراف کی طرف موڑا ہے۔ "سوانح" نامی کالم میں مولانا شبلیؒ کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "حرف وحکایت" کے زیر عنوان ٹالسٹائی کا ایک ستھرا افسانہ دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ۸۴ صفحات کے اس چھوٹے سے رسالے میں نثر و نظم کا سنجیدہ اور نشاطیہ ہر دو قسم کا عمدہ مواد سمیٹنے کی قابل قدر کوشش کی گئی ہے۔

نظم کا حصہ نثر کے مقابلے میں برائے نام ہے۔ لیکن "کیف" کے لحاظ سے بہت وقیع ہے۔ روش صدیقی صاحب کی نظم "لیلائے بام" تو پڑھنے اور وجد کرنے کی چیز ہے۔ چند شعر سنتے چلیے۔ طوائف کے لئے "لیلائے بام" کا لفظ ذہن میں رکھیئے :-

زرو جاہ تودۂ خاک ہے ÷ نہ پرستش زرو جاہ کر
نہ مٹا صداقتِ روح کو ÷ نہ گناہِ عذرِ گناہ کر
ہے ضمیر آئینۂ خدا ÷ نہ اس آئینے کو سیاہ کر

ہے وہ ایک چشمۂ تیرگی ÷ جو تری نگاہ میں نور ہے
ہے شکست تیرے غرور کی ÷ تجھے جس کشش پہ غرور ہے

رسالے کی قیمت صفحات کے لحاظ سے کافی زیادہ ہے۔ مواد کے لحاظ سے کم ہے! کاش یہ تضاد نہ ہوتا! (ش - ن)

جواہر القرآن • افادات شیخ التفسیر حضرت مولانا حسین علی صاحب • ترتیب از :- شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خاں صاحب • ناول سائز۔

• صفحات ۱۹۲ • مجلد مع خوبصورت گردپوش۔

• قیمت قسم اول مجلد ڈھائی روپے۔ غیر مجلد دو روپے۔ قسم دوم مجلد دو روپے۔ غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

• شائع کردہ :- کتبخانہ رشیدیہ۔ ۲۰ مدینہ مارکیٹ۔ راولپنڈی

توحید کیا ہے اور شرک کیا؟ — یہ ایک بہت ہمہ گیر

سوال ہے اور اس سوال کے صحیح جواب پر انسان میں وہ عقیدۂ اساسی پیدا ہوتا ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ مولانا حسن علیؒ میں غیرتِ توحید اپنے درجۂ کمال کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہ اسی غیرتِ بندگی کا فیضان ہے کہ ان کے علمی غور و فکر نے ان تمام خطرناک گوشوں کو پکڑ لیا ہے جہاں جہاں سے شرک کے آخرت سوز جراثیم توحید کے عقیدے میں گھس آسکتے ہیں۔ قرآن مجید کی روشنی میں توحید و شرک کا یہ ایمان افروز بیان پڑھکر یہ غلط فہمی دُور ہو جاتی ہے کہ صرف خدا کو ایک ماننے ہی کو توحید کہتے ہیں ۔ مولانا نے یہاں چونکایا ہے اور بتایا ہے کہ خدا کی ذات میں اور اس کی صفات میں تو مشرکین مکہ بھی شک و شبہ نہ کرتے تھے مگر ان کا تصور یہ تھا کہ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے خدا کی صفات کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا تھا۔

یہ کتاب بتاتی ہے کہ کس طرح خدا کے سوا دوسری ہستیوں سے مرادیں چاہنا ' مدد طلب کرنا ' ان کی نذر و نیاز قرآن کی اطلاعات کے مطابق سابقہ قوموں کو توحید سے محروم کر کے شرک و بدعت کے تاریک غار میں دھکیلتا رہا ہے اسکے بعد قرآن مجید کی تعلیمات کو احادیث صحیحہ کی مدد سے پورے شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب کے صفحات میں پھیلایا گیا ہے ، شرک اور توحید کے مسائل پر ایمان افروز گفتگو کے بعد قرآن مجید کی ان مخصوص لفظی اور طرزِ اظہار و بیان کی اصطلاحی خصوصیات کو سمجھایا گیا ہے جن کو سمجھے بغیر قرآن مجید کی بات کو ٹھیک طور پر اور پورے طریقے سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

اس طرح یہ کتاب شرک و بدعت کے اس فتنہ ساماں دَور میں ہر اس بندۂ مومن کے دیکھنے کی چیز ہے جس کو یہ خوف اور فکر ہو کہ میں آخرت میں خدا نخواستہ ہلاک نہ ہو جاؤں مرآۃ الحقیقت صفحہ ۸ سطر ۸ مطبوعہ مصر کے باقاعدہ حوالے کے ساتھ کتاب ہذا کے صفحہ ۸۹ پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا وہ فتویٰ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں کہ جس میں حضورؐ کو عالم الغیب ماننے والے کو کافر قرار دیا گیا ہے ـــ مگر اربابِ بدعت ہیں کہ اسی ہستی کو خود بھی عالم غیب اور کارساز و حاجت روا مانتے ہیں ۔ لائیے جواب !

مولانا موصوف صرف مرحوم و مغفور پر عقیدۂ توحید کا بڑا غلبہ ہے اس لئے کہیں کہیں " شدت " کا احساس ہوسکتا ہے مگر یہ شدت عناد آمیز نہیں خالص دردمندانہ ہے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (جیسا کہ انھوں نے تقریظ میں فرمایا ہے) یہ آں مرحوم کی کیفیتِ ایمانی کا نتیجہ ہے جو صوفیاء کی اصطلاح میں ایک خاص الخاص کیفیت ہے۔

افسوس کہ کتابت و طباعت اس درجہ کی نہیں جس پایہ کی یہ کتاب ہے ـــ پھر بھی ایسی گئی گذری بھی نہیں کہ پڑھنے میں دشواری ہو ـــ کاش اس کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی شگفتگی کا اہتمام بھی کیا جا سکے۔ (ش ۔ ن)

ملاقاتیں • مرتبہ :۔ جناب الطاف حسین قریشی۔ • لکھائی چھپائی ' کاغذ اور سائز سب دلکش اور نظر افروز • صفحات ۲۷۱ • گرد پوش سرورق جاذبِ نظر • قیمت مجلد پانچ روپے۔

اخبارات کے نامہ نگاروں کا ممتاز شخصیتوں سے مل کر مختلف موضوعات پر ان کے خیالات معلوم کرنا اور پھر انھیں پریس کے سپرد کر دینا آج کل کا معروف طریق ہے۔ اسے اصطلاح میں " انٹرویو " کہتے ہیں۔ کسی ماہنامے کے ایڈیٹر نے " انٹرویو " کو اپنے ماہنامے کا مستقل کالم بنایا ہو یہ ہمارے علم میں نہیں ۔ پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ لاہور کے کثیر الاشاعت اور حسین و وقیع " اردو ڈائجسٹ " کے مدیر جناب الطاف قریشی نے اپنے اس ماہنامے میں اس کالم کو ثبات و استقلال بخشا اور بڑے اہتمام اور لگن کے ساتھ ممتاز حضرات سے ملاقاتیں کر کے ان کی مفید اور دلچسپ رودادیں زیبِ قرطاس کیں۔

یہ کتاب ان سولہ ملاقاتوں کی تفصیلات کا گلدستہ ہے جو " اردو ڈائجسٹ " میں ماہ بماہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں اربابِ ذوق کے لئے وہ سب کچھ ہے جو ایک فکر انگیز

اور بیش بہا صحیفے میں ہونا چاہیے۔ بسم اللہ مولانا مودودی کے انٹرویو سے ہوئی ہے۔ حق یہ ہے کہ ہونی بھی چاہیے تھی ہندو پاک ہی نہیں صرف ایشیا بھی نہیں، پوری دنیا میں اس وقت مولانا مودودی کی ہستی بعض اعتبار سے بے مثال ہے وہ اپنے دور کے ابن تیمیہ ہیں۔ ان جیسے عبقری انسانوں کو جنم دینے کے لئے گردش دوراں کو کم سے کم سو سال کی مدت درکار ہوتی ہے۔ وہ کیا ہیں اس کی تمام و کمال حقیقت انشاء اللہ اس دن کھلے گی جب قیامت کے دن ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق جزا و سزا سے نوازا جائے گا۔ ویسے آج بھی جو لوگ تعصب اور بدباطنی کا شکار نہیں ہیں اتنا تو دیکھ ہی سکتے ہیں کہ فکر و نظر کے کتنے ہی میدانوں میں اللہ کا یہ بندہ باطل سے کیسی دل سے جو کبھی لڑ رہا ہے اور اکیلا لڑ رہا ہے۔ باطل کے آہنی اعصاب کو شکست نہیں دے سکی حالانکہ اس کا عضو عضو زخموں سے چور ہے اور اس کی ایک سادہ سی تلوار کے مقابلے میں جدید و قدیم ہر طرح کے ہتھیار بڑی فنکاری اور مہارت کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔

یہ کہنا تو تحصیل حاصل ہی ہوگا کہ یہ پہلا انٹرویو لب و معانی کے اعتبار سے بھی تقدم ہی کا مستحق تھا۔

دوسرا انٹرویو مسٹر اے۔ کے بروہی کا ہے۔ ہونے کو بلا سے وہ مسٹر ہوں مگر انٹرویو ثابت کرتا ہے کہ انکی روح "مولوی" ہے ــــ مولوی آج کل کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں جن میں عارف زمانہ مولانا روم مولوی تھے عجیب طرح کی مسرت ہوئی جب انٹرویو کے آئینے میں ایک "مسٹر" کو سوز دردمندی اور فراستِ مومنانہ کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھا۔ سادہ الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مسٹر بروہی کا انٹرویو فکری اصابت و طہارت کا بڑا شاندار مظہر ہے۔

باقی چودہ اصحاب کے انٹرویوز بھی اپنی جگہ قیمتی، فکر انگیز اور وقیع ہیں مگر کہ بعض حضرات کے خیالات سے کلی اتفاق ممکن نہیں ہے مثلاً جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے آرٹ، عورت اور ثقافتِ اسلامیہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ انسانی نفسیات اور سرشت و جبلت کے گہرے اور حقیقت پسندانہ مطالعہ پر مبنی نہیں بلکہ مقلدانہ انداز کا ہے تعجب یہ ہے کہ ایک عظیم جج ہونے کے باوجود وہ نفسیات اور منطق کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں کی دنیائیں الگ الگ ہیں۔

اسی طرح بعض دیگر حضرات نے کچھ ایسی باتیں ارشاد کر دی ہیں جن پر دین و اخلاق کے رخ سے کافی جرح کی جا سکتی ہے ــــ تاہم یہ ایک قدرتی صورت حال ہے جسے گوارہ کرنا چاہیے۔ کیسے ممکن ہے کہ مغربی درسگاہوں سے فیض یافتہ حضرات مذہب و اخلاق کے مسائل میں ہماری ہی طرح سوچیں اور ایسے ہی فکری زاویے اختیار کریں جن سے ہمیں سرمو اختلاف نہ ہو۔

انٹرویو کے علمی و فکری مراتب کا مدار بہت کچھ انٹرویو لینے والے کے سلیقے اور ذہانت پر بھی ہوتا ہے۔ موضوع گفتگو تو وہی اپنے سوالات کے ذریعے متعین کرتا ہے۔ محترم قریشی صاحب اگر خیالات اور میلان و رجحان کے اعتبار سے شائستہ اور متین نہ ہوتے تو یہ ملاقاتیں زیادہ قدر و قیمت کی حامل نہیں ہو سکتی تھیں۔

کتاب کے آغاز میں وقار عظیم صاحب کا پیش لفظ بھی بلیغ اور جاندار ہے۔ غرض کتاب ہر لحاظ سے لائق قدر اور افادیت سے لبریز ہے۔ قریشی صاحب کی انشاء میں کہیں کہیں نظر ثانی کی بھی ضرورت محسوس ہوئی مگر برائے نام۔ جیسے صفحہ ۱۸۵ پر:۔

"خدا کے سامنے ہر فرد نے اپنے ایک ایک سانس کا حساب دینا ہے۔"

"نے" کی جگہ "کو" ہونا چاہیے۔ یا جیسے صفحہ ۲۱۳ پر بعض بکتوں ــــ نقطے اور نکتے کا استعمال بھی ایک سے زائد جگہ نادرست ہوا ہے۔ اگلے ایڈیشن میں ایسی فروگذاشتیں درست کر دی جائیں تو سبحان اللہ۔

(ع - ع)

(باقی صفحہ ۸۵ پر)

سرمہ دُرِ نجف

○ جو تقریباً سترہ سال سے آپ کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

○ آنکھ کے اکثر امراض اور کمزوری کے لیے بینظیر ہے۔

○ ایک قدیمی نسخے سے تیار کیا ہوا جس میں سچے موتی اور دیگر قیمتی و مفید اجزا شامل ہیں

○ بغیر کسی مرض کے بھی استعمال کرتے رہیے کہ یہ آخری عمر تک نگاہ کو قائم رکھتا ہے اور مرض کے حملوں سے بچاتا ہے۔

○ مضبوط شیشی دھات کے پائیدار خول میں۔

○ ایک یا دو شیشی منگوانے پر محصولڈاک ایک روپیہ آٹھ آنے لگتا ہے۔

○ ایک ساتھ تین شیشی منگوانے پر (خواہ چھ ماشہ والی ہوں یا ایک تولہ والی) محصول و مصارف چھوڑ دیا جاتا ہے۔

○ ایک تولہ والی شیشی کی قیمت پانچ روپے۔ اور چھ ماشہ والی شیشی کی قیمت تین روپے

دُرِ نجف کی تعریف کرنیوالے چند حضرات کے نام ملاحظہ ہوں

مولانا حسین احمد مدنی رح مولانا شبیر احمد عثمانی رح مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب عثمانی رح مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب (ندوۃ المصنفین دہلی) و مولانا اشتیاق صاحب خوشنویس (مدرس دارالعلوم) وغیرہ وغیرہ۔

ملنے کا پتہ [illegible]

مفہومِ القرآن

ترجمہ قرآنِ پاک نظم میں

مختلف مکتبہ فکر کے علمائے کرام کا مصدقہ

● ایک صفحہ پر عربی متن، ترجمہ اور تفسیر شاہ عبدالقادر صاحب رح

● سامنے کے صفحہ پر کیفی مجوپالی کی نظم

رنگین سرورق، دو رنگوں میں عکسی طباعت

ہر پارہ الگ الگ جلد میں

پارہ عم چھپ کر تیار ہے ● ہدیہ فی جلد تین روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

شائع کردہ معراج پبلیکیشنز شیخ سلیم گیٹ وارانسی (یو۔پی)

ملنے کا پتہ

مکتبہ تجلی [illegible] (یو۔پی)

TAJALLI MONTHLY, DEOBAND (U.P.) AUGUST 1964 Regd. No. L-972